gd.'L. No. 7243

Phone : 8

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جنوری 1968

١٠
٥٢
٦

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔ بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ : ایک روپ

محترم خواجہ شہاب الدین

صدر مذاکرہ

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

ٹیلیفون	قیمت فی پرچہ	بدلِ اشتراک
۸۰۸۰۰	پاکستان - ایک روپیہ	سالانہ — پاکستان — دس روپے
خط و کتابت	ہندوستان - ڈیڑھ روپیہ	سالانہ — ہندوستان — پندرہ روپے
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵- بی - گلبرگ - لاہور		سالانہ — غیر ممالک — ایک پونڈ

شمارہ (۱)	جنوری ۱۹۶۸ء	جلد (۲۱)

فہرست

۱- لمعات — ۲

۲- اسلام میں فکر کی گنجائش (محترم پرویز صاحب) — ۱۱

۳- پنجاب یونیورسٹی کا شعبۂ اسلامیات (شاہد عادل) — ۱۸

۴- رابطۂ باہمی — ۲۴

۵- طلوعِ اسلام کنونشن - بزمِ مذاکرہ

آثار بتاتے ہیں سحر ہو کے رہیگی — ۲۵

افتتاحیہ از صدر مذاکرہ — ۲۶

۱- پروفیسر خالد اسلام — ۲۹

۲- اختر عباس سعید — ۳۵

۳- بیگم ثریا عندلیب — ۳۹

۴- پرویز رحیم — ۴۴

۵- (عزیزہ) غزالہ خان — ۴۹

۶- فریدالدین احمد — ۵۲

۷- (بیگم) خضر عارفی — ۶۰

۸- سراج منیر — ۶۱

۹- (عزیزہ) عفت خلیل — ۶۸

۱۰- دو بچیاں — نجمہ کوثر — ۷۲

سلیم پرویز — ۷۴

اختتامیہ — از صدر مذاکرہ — ۷۶

ایڈیٹر محمد خلیل، ناشر سراج الحق، مقام اشاعت - ۲۵/بی گلبرگ - لاہور، پرنٹر - شیخ محمد اشرف، مطبوعہ - اشرف پریس ایبک روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

کراچی سے ہمیں ایک تفصیلی خط موصول ہوا ہے جس کا ملخص یہ ہے کہ جب طلوع اسلام اور (مودودی صاحب کا) ترجمان القرآن اسلام کی تبلیغ کرتے ہیں، دونوں کا مقصد اسلامی نظام کا احیاء ہے تو پھر ان میں اس قدر باہمی اختلاف کیوں ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ دونوں مل بیٹھیں اور متحدہ طور پر اس مقصد کے حصول کے لئے جدوجہد کریں! ہمیں کراچی کے اس مکتوب نگار سے ذاتی تعارف حاصل نہیں لیکن انکے انداز نگارش سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ تجویز بڑے خلوص اور دردوسوز سے پیش کی گئی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس کا جواب دینا ضروری سمجھا ہے۔ (یہ جواب طلوع اسلام کے صفحات پر اس لئے شائع کیا جا رہا ہے کہ ہمیں اس قسم کے خطوط اور گوشوں سے بھی موصول ہوتے رہتے ہیں)

مودودی صاحب کے ذہن میں اسلام کا تصور کیا ہے اور وہ نظام کس قسم کا ہے جسے وہ اسلامی کہہ کر اس ملک میں نافذ کرنا چاہتے ہیں، اس کی وضاحت بڑی تفصیل طلب ہے۔ اس لئے ہم سردست اس موضوع کو زیر بحث نہیں لانا چاہتے۔ لیکن اتنا تو بہرحال ظاہر ہے کہ آپ جس شخص سے روابط پیدا کرنا چاہیں گے اس کے متعلق اتنا ضرور دیکھ لیں گے کہ اس کے اصول زندگی کیا ہیں اور اس کا کردار کس قسم کا ہے۔ اگر اس کے اصول و کردار قابل اعتماد نہ ہوں تو آپ اس سے رشتۂ یگانگت و رفاقت استوار کرنا تو ایک طرف، کاروباری شراکت تک بھی گوارا نہیں کریں گے۔ آیئے! ہم دیکھیں کہ اس سلسلہ میں مودودی صاحب کی کس قسم کی تصویر ہمارے سامنے آتی ہے۔

اخلاقیات کی دنیا میں، سب سے بنیادی صفت سچ بولنا ہے۔ مغرب کی میکیاولی سیاست میں تو جھوٹ بولنا اور فریب دینا بے شک جائز اور مستحسن قرار دیا جاتا ہے لیکن اسکے علاوہ، عالم مذاہب تو ایک طرف

مذہب اور خدا کے منکر دہریوں تک کے ہاں بھی دروغ گوئی اور فریب دہی کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ دنیا کا کوئی شریف آدمی کسی جھوٹے انسان کے پاس تک بیٹھنا پسند نہیں کرتا، چہ جائیکہ وہ اس کے ساتھ تعلقات قائم رکھے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے لئے نہ کسی دلیل کی ضرورت ہے، نہ تائید و شہادت کی حاجت۔
لیکن دیکھئے مودودی صاحب کا اس باب میں کیا "عقیدہ" ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

> راستبازی اور صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے۔ اور جھوٹ اس کی نگاہوں میں ایک بدترین برائی ہے۔ لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے، بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔ (ترجمان القرآن - مئی ۱۹۵۸ء)

اس میں کہا یہ گیا ہے کہ ضرورت کے وقت جھوٹ بولنا نہ صرف جائز ہے بلکہ "از روئے شریعت" واجب ہو جاتا ہے۔ پہلے تو آپ یہ دیکھئے کہ کوئی صاحب ہوش و حواس، بلا ضرورت کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ آپ کسی شخص سے پوچھئے کہ "تم نے جھوٹ کیوں بولا؟" وہ بلا تامل جواب دے گا کہ "مجھے کیا ضرورت تھی جو میں جھوٹ بولتا؟"۔ جھوٹ اور سچ کے متعلق فیصلہ کرنے کا تو وقت ہی وہ ہوتا ہے جب انسان دیکھے کہ سچ بولنے سے کوئی ضرورت رک جاتی ہے اور جھوٹ بولنے سے وہ ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔ ایسے وقت، جو شخص اپنی ضرورت کو ترجیح دیتا ہے وہ جھوٹ بول کر اسے پورا کر لیتا ہے۔ جو صداقت کو زیادہ اہمیت دیتا ہے وہ اپنا نقصان برداشت کر لیتا ہے لیکن جھوٹ نہیں بولتا۔ اسی کو صاحبِ کردار کہا جاتا ہے۔ دنیا میں وہی شخص قابلِ اعتماد اور واجب الاحترام قرار پاتا ہے جس کی کیفیت یہ ہو کہ

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق!

ایک طرف، دنیا کے ضابطۂ اخلاق کا یہ اولین اصول ہے اور دوسری طرف مودودی صاحب ہیں جن کا عقیدہ یہ ہے کہ ضرورت کے وقت جھوٹ بولنا نہ صرف جائز ہے بلکہ واجب قرار پا جاتا ہے --- اور ستم بالائے ستم کہ اسے وہ اپنا ذاتی خیال نہیں کہتے۔ اسلام کا فیصلہ (فتویٰ) قرار دیتے ہیں! یا للعجب! --- جہاں تک ہمیں معلوم ہے دنیا میں صرف ہندوستان کے ٹھگوں کا فرقہ ایسا تھا جو جھوٹ اور فریب کو اپنے عقیدہ کی رُو سے جائز سمجھتا تھا۔

ہم اپنے مراسلہ نگار سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ جس شخص کا یہ عقیدہ اور مسلک ہو، کیا آپ اس کے ساتھ کسی قسم کے تعلقات پیدا کرنا گوارا کریں گے؟

مودودی صاحب اپنے سادہ لوح متبعین کی تسکینِ خاطر کے لئے (جسے کھلے الفاظ میں ابلہ فریبی کہنا

چاہیئے) اپنے اس عقیدہ کی تائید میں فرماتے ہیں۔

> صلح بین الناس اور ازدواجی تعلقات کی درستی کے لئے اگر صرف صداقت کو چھپانے سے کام نہ چل سکتا ہو تو ضرورت کی حد تک جھوٹ سے بھی کام لینے کی شریعت نے صاف اجازت دی ہے۔ جنگ کی ضروریات کے لئے تو جھوٹ کی صرف اجازت ہی نہیں بلکہ اگر کوئی سپاہی دشمن کے ہاتھ گرفتار ہو جائے اور دشمن اس سے اسلامی فوج کے راز معلوم کرنا چاہے، تو ان کا بتانا گناہ اور دشمن کو جھوٹی اطلاع دے کر اپنی فوج بچانا واجب ہے۔ اسی طرح اگر کوئی ظالم کسی بے گناہ کے قتل کے درپے ہو اور وہ غریب کہیں چھپا ہوا ہو تو سچ بول کر اسکے چھپنے کی جگہ بتا دینا گناہ، اور جھوٹ بول کر اس کی جان بچا لینا واجب ہے۔
>
> (ایضاً)

اسے کہتے ہیں ملمع ساز منطق (FALLACIOUS LOGIC)۔ ذرا سوچئے کہ لوگوں میں جو صلح اور میاں بیوی میں جو مصالحت، جھوٹ بول کر کرائی جائے گی، وہ قائم کتنے دنوں تک رہے گی؟ چند ہی روز بعد جب وہ جھوٹ منکشف کر سامنے آئے گا تو اس سے لوگوں میں جو فساد برپا ہوگا اور میاں بیوی میں جو کشیدگی پیدا ہوگی وہ پہلے سے کہیں زیادہ شدید اور مہیب ہوگی۔ صلح وہی دیرپا اور مصالحت وہی استوار ہو سکتی ہے جو واقعات کو بلاکم و کاست سامنے لاکر فریقین کے دل و دماغ کے کامل اطمینان سے کرائی جائے۔

اب مودودی صاحب کی پیش کردہ باقی دو مثالوں کو لیجئے۔ ایک سچا مسلمان سپاہی جب دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو جائے گا تو خواہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کیوں نہ کر دیئے جائیں، وہ نہ اپنی فوج کا پتہ بتائیگا نہ جھوٹ بول کر اپنی جان بچائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی ظالم کسی مرد مومن سے مظلوم کی بابت دریافت کرنا چاہے گا تو وہ اپنی جان دے دیگا لیکن نہ جھوٹ بولے گا، نہ مظلوم کا پتہ نشان بتائے گا۔ دنیا نے انہی جواں ہمت صداقت شعار انسانوں کے مجسمے نصب کئے ہیں جنہوں نے ہر قسم کی اذیت برداشت کی، لیکن نہ راز افشا کیا نہ جھوٹ بولا۔ ہم بھی اپنی تاریخ سے ان لوگوں کو بطور فخر دنیا کے سامنے پیش نہیں کرتے جنہوں نے جھوٹ بول کر مملکتوں کو بچایا تھا۔ ہم انہی کے کارناموں پر فخر کرتے ہیں جنہوں نے جان دے دی تھی لیکن نہ مملکت کے ساتھ غداری کی تھی نہ ہی جھوٹ بول کر اپنی جان بچائی تھی۔ "دروغ مصلحت آمیز" اس ضابطۂ اخلاق کا اصول ہے جو ہمارے دور مملوکیت میں وضع اور مرتب ہوا تھا۔ اور

جس میں لوگوں کو تعلیم یہ دی جاتی تھی کہ

اگر شہ روز را گوید شب است ایں
بباید گفت، اینک ماہ و پرویں

(اگر بادشاہ دن کو رات کہے تو تم فوراً کہدو کہ بالکل ٹھیک۔ وہ دیکھئے چاند چڑھ رہا ہے، اور یہ دیکھئے ستارے چمک رہے ہیں!)

اس ضابطۂ اخلاق کو اسلام کی طرف منسوب کرنا، انتہائی دیدہ دلیری اور اپنی سیاسی مصلحت کوشیوں کے لئے راہِ جواز تراشنے کی نہایت مذموم کوشش ہے۔ آپ سوچئے کہ کیا ایسے لوگوں پر جو عند الضرورت جھوٹ بولنا جائز ہی نہیں بلکہ واجب سمجھتے ہوں، ذرا بھی بھروسہ کیا جا سکتا ہے؟

اب ایک قدم اور آگے بڑھئے۔ انسانی ضابطۂ اخلاق کی دوسری بنیادی شق اصول پرستی ہے۔ آپ انسانیت کی پوری تاریخ پر نگاہ ڈالئے اور خود اپنے زمانے کو بھی جانچئے، پرکھئے۔ دنیا نے عزت انہی لوگوں کی کی ہے جنہوں نے سخت سے سخت نامساعد حالات میں بھی اصول پرستی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ دنیائے اخلاق و شرافت میں "بے اصولا" بدترین گالی ہے۔ کوئی شریف آدمی اپنے متعلق یہ الفاظ سننا پسند نہیں کرے گا، اور کوئی شخص ایسے انسان کو اپنے پاس بٹھانے تک کا روادار نہیں ہوگا۔ قرآن کریم کو شروع سے اخیر تک دیکھ جائیے، وہ اصول پرستی کو حسنِ عمل کی بنیادی اینٹ قرار دیتا ہے۔ وہ زندگی کی سرفرازیوں کا مستحق انہی کو قرار دیتا ہے جو "قَالُوا رَبُّنَا اللّٰہُ" کے بعد "ثُمَّ اسْتَقَامُوْا" کی شرط پر پورے اترتے ہیں۔ یعنی جب وہ حق و صداقت پر مبنی اصول کو علیٰ وجہ البصیرت اختیار کرتے ہیں، تو اس پر جم کر کھڑے رہتے ہیں اور دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی تکلیف اور مصیبت ان کے پائے استقلال میں لغزش نہیں پیدا کرتی ۔ "وفاداری بشرطِ استواری" ہی قرآن کی رو سے "اصلِ ایمان" ہے۔ جو مصلحت کی خاطر اپنے محکم اصولوں کو چھوڑ دیتا ہے یا ان میں لچک پیدا کر لیتا ہے، اس پر کبھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس باب میں مودودی صاحب کا "مذہب" کیا ہے۔ اسے غور سے دیکھئے۔ ۱۹۵۷ء کا ذکر ہے کہ ان کی جماعت کے بعض سرکردہ اراکین نے ان پر الزام عاید کیا کہ اس تنظیم کے ابتدائی مراحل میں آپ جن بلند آہنگ اصولوں کی تبلیغ کیا کرتے تھے۔ اور جن کی بنیادوں پر اس تنظیم کی عمارت استوار ہوئی تھی، اب عملی سیاست کے وقت آپ ان میں سے ایک ایک کو توڑتے چلے جاتے ہیں۔ یہ کہاں کی دیانتداری ہے؟ اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ میں نے اگر ایسا کیا ہے تو کوئی انوکھی بات نہیں کی (معاذ اللہ، معاذ اللہ۔ نقلِ کفر کفر نباشد)۔ خود رسول اللہؐ نے یہی کیا تھا۔ مثلاً:

اسلامی نظام کے اصولوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ تمام نسلی اور قبائلی امتیازات کو ختم کر کے اس برادری میں شامل ہونے والے سب لوگوں کو یکساں حقوق دیئے جائیں اور تقوے کے سوا فرقِ مراتب کی کوئی بنیاد نہ رہنے دی جائے۔ اس اصول کو قرآن مجید میں بھی پیش کیا گیا اور حضورؐ نے بھی بار بار اس کو نہ صرف زبان مبارک سے بیان فرمایا بلکہ عملاً موالی اور غلام زادوں کو امارت کے مناصب دے کر واقعی مساوات قائم کرنے کی کوشش بھی فرمائی۔ لیکن ـــــ جب پوری مملکت کی فرمانروائی کا مسئلہ سامنے آیا تو آپ نے ہدایت دی کہ "الائمۃ من قریش"۔ امام قریش میں سے ہوں گے۔ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس خاص مسئلہ میں یہ ہدایت، مساوات کے اس عام اصول کے خلاف پڑتی ہے جو کلیہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔　　(ترجمان القرآن۔ دسمبر ۱۹۵۲ء)

یہ وہ سخت جھٹکا تھا جسے وہ لوگ بھی برداشت نہ کر سکے جو اس سے قبل سولہ سال تک ہر جائز و ناجائز میں اس شخص کا ساتھ دیتے چلے آ رہے تھے۔ چنانچہ وہ استغفراللہ کہہ کر ان سے الگ ہو گئے۔

ہم اپنے مراسلہ نگار سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا آپ ہمیں اس شخص کا ساتھی بننے کی تلقین فرماتے ہیں جس کے نظریات یہ ہوں؟

لیکن بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی کہ یہ صاحب جھوٹ بولنے اور اصول شکنی کو جائز اور واجب قرار دیتے ہیں۔ بات اس سے آگے بڑھتی ہے اور بہت دور تک آگے بڑھتی ہے۔ آپ کسی جھوٹے اور اصول شکن سے (اس کا جھوٹ اور اصول شکنی ثابت ہو جانے کے بعد) کہئے کہ تم نے جھوٹ بولا اور اصول شکنی کی ہے، تو وہ ندامت سے اپنی گردن جھکا لے گا۔ لیکن ایک یہ صاحب ہیں کہ جب ان سے کہا جائے کہ آپ جھوٹ بولتے اور اصول شکنی کرتے ہیں تو یہ (بجائے اس کے کہ شرم سے اپنی نگاہیں نیچی کر لیں) پوری ڈھٹائی سے کہتے ہیں کہ میں یہ کچھ اپنے طور پر نہیں کرتا۔ یہ تو اسلام کی تعلیم اور رسول اللہ کا عمل ہے جس کا میں اتباع کرتا ہوں ـــــ یہ کہتے ہیں اور دل میں قطعاً خوف نہیں کھاتے کہ یہ کچھ میں کس ذات گرامی کے متعلق کہہ رہا ہوں! اس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کے متعلق، جو شرفِ و مجدِ انسانیت کی معراج کبریٰ پر فائز ہے۔ جس کے متعلق خود خدا سے بزرگ و برتر شہادت دیتا ہے کہ ـــ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ۔ "تو اخلاقِ انسانی کے بلند ترین مقام پر فائز ہے"۔ ـــ جس کے نقوشِ قدم پر اس سعادت بخت انسان

کے لئے جو زندگی کی منزلِ مقصود تک پہنچنا چاہتا ہو، دلیل راہ اور خضرِ طریق بنتے ہیں۔ اُس ذاتِ گرامیؐ کے متعلق یہ کچھ کہنا اور خدا کے غضب سے نہ ڈرنا، اس کی جرأت اسی شخص کو ہو سکتی ہے، جس کے دل میں خدا کے سامنے جانے کا خیال تک نہ آتا ہو۔ کوئی اور ایسی جسارت نہیں کر سکتا۔

کیا آپ ایسے ان کا ساتھی بننا چاہتے ہیں؟ یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ ھٰذَا۔

جب ان پر اعتراض کیجئے تو جواب میں کہا جاتا ہے کہ مودودی صاحب نے جو کچھ کہا ہے انہوں نے اس کی تائید اور سند میں احادیث پیش کی ہیں۔ اس لئے اس سلسلہ میں انہیں مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا ——— اور یہ ہے وہ مقام جہاں سے موضوع کا رخ اس طرف مڑ جاتا ہے کہ وہ اسلام کس قسم کا ہے جسے مودودی صاحب یہاں رائج کرنا چاہتے ہیں۔

احادیث کی صورت یہ ہے کہ ان کے مجموعوں میں صحیح حدیثیں بھی ہیں اور وضعی بھی۔ ہمارے ہاں ایک فرقہ (اہل حدیث) وہ ہے جو ان مجموعوں میں سے دو مجموعوں (بخاری، مسلم) کی تمام حدیثوں کو صحیح مانتا ہے اور ان میں سے کسی ایک کے انکار کو بھی کفر قرار دیتا ہے۔ مودودی صاحب ان سے متفق نہیں۔ ان کے نزدیک احادیث کا کوئی مجموعہ بھی ایسا نہیں جس کی تمام احادیث صحیح ہوں۔ حتےٰ کہ ان کے نزدیک۔

> یہ دعویٰ کرنا بھی صحیح نہیں کہ بخاری میں جتنی حدیثیں ہیں، ان کے مضامین کو بھی جوں کا توں قبول کر لینا چاہیئے۔ (ترجمان القرآن۔ اکتوبر، نومبر ۵۲ء)

دوسرا گروہ (اہل فقہ کا) ہے، جن کا عقیدہ یہ ہے کہ ان مجموعوں میں صحیح حدیثیں بھی ہیں اور غلط بھی لیکن محدثین اور ائمہ فقہ نے صحیح اور غلط میں امتیاز کر دیا ہوا ہے۔ جن احادیث کو انہوں نے صحیح قرار دے دیا ہے انہیں ہم صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ مودودی صاحب ان سے بھی متفق نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ

> کوئی روایت جو رسول اللہ کی طرف منسوب ہو اس کی نسبت کا صحیح اور معتبر ہونا خود زیر بحث ہوتا ہے۔ آپ (فریق مقابل) کے نزدیک ہر اس روایت کو حدیثِ رسولؐ مان لینا ضروری ہے جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں۔ ہم سند کی حجت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے۔ (رسائل و مسائل حصہ اول ص۲۹۰)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ احادیث کی صحت و سقم کے پرکھنے کا جو معیار اس وقت تک چلا آ رہا تھا، مودودی صاحب جب اسے بھی سند تسلیم نہیں کرتے، تو پھر ان کے نزدیک اس کا معیار کیا ہے؟ اس

کے جواب میں وہ کہتے ہیں کہ

> جس شخص کو اللہ تعالےٰ تفقہ کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے اس کے اندر قرآن اور سیرت رسولؐ کے غائر مطالعہ سے ایک خاص ذوق پیدا ہو جاتا ہے جس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات کو پرکھ لیتی ہے..... اس کا ذوق اسے بتا دیتا ہے کہ کون سی چیز اسلام کے مزاج اور اس کی طبیعت سے مناسبت رکھتی ہے اور کون سی چیز نہیں رکھتی۔ روایات پر جب وہ نظر ڈالتا ہے تو ان میں بھی یہی کسوٹی رد و قبول کا معیار بن جاتی ہے۔ اسلام کا مزاج عین ذاتِ نبویؐ کا مزاج ہے۔ جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے ...... وہ نبیؐ اکرم کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت بتا دیتی ہے کہ اس میں سے کون سا قول یا کون سا فعل میرے سرکارؐ کا ہو سکتا ہے اور کون سی چیز سنتِ نبویؐ سے اقرب ہے۔[1]
>
> (تفہیمات ۔ حصہ اول ۔ ص ۳۲۳)

یہاں سے بات واضح ہو گئی کہ مودودی صاحب اس کے پابند نہیں کہ احادیث کے مجموعوں میں جسے حدیث کو محدثین نے صحیح قرار دے دیا ہے وہ اسے بالضرور صحیح سمجھیں۔ وہ ان مجموعوں کو خود دیکھتے ہیں اور ان کی نگہ بصیرت انہیں بتا دیتی ہے کہ فلاں قول یا فعل فی الواقعہ رسول اللہؐ کا ہے۔ احادیث کے مجموعوں میں وہ روایات بھی ہیں جن میں جھوٹ بولنے اور اصول شکنی کرنے کی سخت مذمت کی گئی ہے اور ایسی روایات بھی جن میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہؐ نے (معاذ اللہ) صحابہؓ کو جھوٹ بولنے کی اجازت دی اور عملی سیاست کے وقت ان تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیا جنہیں آپ اپنی دعوت کے آغاز میں بایں شدومد پیش فرمایا کرتے تھے۔ ہماری نگہ بصیرت نے ان دونوں قسموں کی روایات کو دیکھا، اور بلا تامل و توقف کہہ دیا کہ جن روایات میں دروغ گوئی اور اصول شکنی کی تائید ملتی ہے وہ ہمارے رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشادات نہیں ہو سکتے۔ یہ روایات وضعی ہیں۔ اور مسترد کئے جانے کے

---

[1] آگے چل کر انہوں نے لکھا ہے کہ جن معاملات میں رسول اللہؐ کی کوئی حدیث نہیں ملتی، مزاج شناس رسولؐ یہ بھی بتا سکتا ہے کہ اگر رسول اللہؐ موجود ہوتے تو وہ اس باب میں کیا حکم دیتے۔

قابل، اس لئے کہ ہمارے نزدیک احادیث کو پرکھنے کا معیار یہ ہے کہ جو حدیث قرآن کے خلاف ہو یا اس سے حضورؐ کی سیرتِ طیبہ پر کسی قسم کا طعن پڑتا ہو، وہ کبھی صحیح نہیں ہو سکتی ـــــ مودودی صاحب کی دگر مزاج شناسِ رسولؐ نے بھی ان ہر دو قسم کی روایات کو دیکھا اور فیصلہ دے دیا کہ جن روایات میں سچ بولنے اور اصولوں پر قائم رہنے کی تاکید ہے وہ رسول اللہ کے ارشادات نہیں ہو سکتے۔ ان کے خلاف جن روایات میں کذب بافی اور اصول شکنی کی تلقین ملتی ہے وہ رسول اللہ کی سچی حدیثیں ہیں۔ انہی روایات کو انہوں نے اپنے عمل کا مدار قرار دے کر جھوٹ بولنے کو واجب اور اصول شکنی کو اتباعِ سنتِ رسول اللہ قرار دے دیا ـــــ اور طلوعِ اسلام کے متعلق یہ ڈھنڈورا پیٹ دیا کہ یہ منکرِ حدیث ہے۔

یہ ہیں مودودی صاحب کے اصولِ زندگی ـــــ اور

یہ ہے وہ اسلام، جسے وہ یہاں رائج کرنے کے لئے اس قدر "جہادِ عظیم" فرما رہے ہیں ـــــ اور

یہ ہے طلوعِ اسلام کے منکرِ حدیث ہونے کے افسانے کی حقیقت ـــــ اور

یہ ہیں وہ وجوہات جن کی بنا پر طلوعِ اسلام مودودی صاحب کے اس "جہاد" کی اس قدر مخالفت کرتا ہے۔ ذرا سوچئے کہ اگر اس جماعت کے ہاتھ میں اقتدار آ جائے تو کسی صداقت شعار، اصول پرست انسان کے لئے اس مملکت میں زندگی بسر کرنا ممکن ہوگا؟

مودودی صاحب پراپیگنڈہ کے فن کے ماسٹر ہیں۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر لوگ طلوعِ اسلام کی باتوں پر کان دھرنے لگ گئے تو ان کا جادو چل نہیں سکے گا۔ اس لئے انہوں نے طلوعِ اسلام کو بدنام کرنا شروع کر دیا۔ آپ سوچئے کہ جن لوگوں کے ہاں، جھوٹ بولنا نہ صرف جائز بلکہ واجب ہو، وہ دوسروں کو بدنام کرنے میں کس حد تک نہیں چلے جائینگے ـــــ "یہ انکارِ حدیث، انکارِ سنت، تین نمازیں، نو دن کے روزے، نیا مذہب، نیا فرقہ، تحریفِ دین، کمیونزم ـــــ سب اسی وجوبِ کذب بافی کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ اس پراپیگنڈہ کے ساتھ وہ دیگر حربے کس کس قسم کے اختیار کرتے ہیں، اس کا اندازہ ایک مثال سے لگایا جا سکتا ہے۔ حکیم عبدالرحیم اشرف، مودودی صاحب کے قدیم معتقدین میں سے تھے۔ (وہ اب ان سے الگ ہو چکے ہیں)۔ انہوں نے اپنے اخبار المنبر کی ۱۹ ستمبر ۱۹۵۸ء کی اشاعت میں لکھا تھا۔

> میں نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے، ۱۰ ستمبر ۱۹۵۸ء کو ملتان جیل میں ملاقات کی۔ اس موقعہ پر منجملہ دیگر امور کے، "منکرینِ سنت" اور ان کے فتنے کا بھی ذکر آ گیا۔ اس پر مولانا ممدوح نے اشاعتِ لٹریچر کی ایک اسکیم بتائی اور اس کی تکمیل کے سلسلہ میں فرمایا کہ آپ چوہدری غلام محمد صاحب سے کہیں

کہ وہ دفتر طلوعِ اسلام سے رابطہ پیدا کریں اور کسی شخص کی تالیف قلب کر کے
اس سے طلوعِ اسلام کے پتے حاصل کریں۔

آپ سوچئے کہ جب طلوعِ اسلام کے پتے چرانے کے لئے اس کے دفتر کے [redacted] کو رشوت تک دینے کی اسکیمیں سوچی جاتی ہیں تو اس سلسلہ میں ان کے ہاں اور کیا کیا نہ ہوتا ہوگا جبکہ انہیں سنگین سے سنگین جرم کے لئے بھی "مقدس سند" مل سکتی ہے۔ چنانچہ مودودی صاحب (ترجمان القرآن کی اسی اشاعت، بابت مئی ۱۹۵۵ء میں جس کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے) لکھتے ہیں کہ ؎

کعب بن اشرف کے قتل کے لئے محمد بن مسلمہ کو جب حضورؐ نے مامور کیا تو انہوں نے اجازت مانگی کہ اگر کچھ جھوٹ بولنا پڑے تو بول سکتا ہوں؟ حضورؐ نے بالفاظ صریح انہیں اس کی اجازت دی۔ (ص۵۵)

یہ ہے وہ اسلام جس کا احیاء یہ جماعت یہاں کرنا چاہتی ہے۔ جو شخص ان تمام اقدامات میں ان کا ساتھ دیگا اسے زندہ رہنے کا حق دیا جائے گا، جو ان سے ہمنوا نہیں ہوگا، اسے مرتد قرار دے کر قتل کر دیا جائے گا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں مودودی صاحب (اپنے کتابچہ ـــــ مرتد کی سزا، اسلامی قانون میں ـــــ میں لکھتے ہیں۔

جس علاقہ میں اسلامی انقلاب رونما ہو وہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دے دیا جائے کہ جو لوگ اسلام سے اعتقاداً منحرف ہو چکے ہیں اور منحرف ہی رہنا چاہتے ہیں وہ تاریخ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کر کے ہمارے نظامِ اجتماعی سے باہر نکل جائیں۔ اس مدت کے بعد ان سب لوگوں کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوتے ہیں مسلمان سمجھا جائے گا۔ تمام قوانینِ اسلامی ان پر نافذ کئے جائیں گے۔ فرائض واجباتِ دینی کے التزام پر انہیں مجبور کیا جائے گا۔ پھر جو کوئی دائرہ اسلام سے باہر قدم رکھے گا اسے قتل کر دیا جائے گا۔ (ص۸)

ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے "اسلام" سے مراد ہوگا وہ طریق جسے جماعت اسلامی صحیح اسلامی طریق قرار دیدے!

کیا ہمارے مکتوب نگار چاہتے ہیں کہ اس قسم کے اسلام کے احیاء کے لئے مودودی صاحب سے تعاون کیا جائے؟

پرویز

اسلام میں "فکر" کی گنجائش

[پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ پولیٹیکل سائنس کی دعوت پر، پرویز صاحب نے ۱۵ر نومبر کی صبح، نیوکیمپس میں، اس شعبہ کے ایم۔ اے (فائنل) کے طلباء و طالبات سے، مندرجہ بالا موضوع پر خطاب فرمایا۔ خطاب برجستہ تھا جسے بعد میں "نوٹس" سے قلمبند کر لیا گیا اور اب نذرِ قارئین ہے۔ (طلوع اسلام)]

محترم پروفیسر صاحب۔ عزیز طلباء علم و طالبات۔ سلام و رحمت!

میں بالعموم تقاریر و تقاریب کے سلسلہ میں کہیں جایا نہیں کرتا۔ اس کے لئے میرے پاس وقت نہیں ہوتا۔ لیکن جب آپ کے نمائندگان نے موجودہ اجتماع کے سلسلہ میں مجھ سے خطاب کے لئے کہا تو میں نے بلاتوقف اظہارِ رضامندی کر دیا۔ یہ اس لئے کہ مجھے اس حقیقت کا اچھی طرح اندازہ اور احساس ہے کہ قوموں کی تشکیل و تعمیر میں نوجوان طالب علموں کا کس قدر ہاتھ ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قوموں کا مستقبل ہوتا ہی ان کی ابھرنے والی نسلوں کے ہاتھ میں ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ جس قسم کے آج کے نوجوان طالب علم، اسی قسم کی کل کی قوم۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے ہمیشہ اپنے پیغام کا اولین مخاطب اسی طبقہ کو قرار دیا ہے اور علامہ اقبالؒ کی ہنوائی میں، میری بھی یہی آرزو ہوتی ہے کہ ؎

جوانوں کو مری آہِ سحر دے		پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے

خدایا! آرزو میری یہی ہے		مرا نورِ بصیرت عام کر دے

عزیزانِ من! اس خطاب کے دعوت نامہ میں تجویز یہ کیا گیا تھا کہ متقدمین میں سے کسی مسلم مفکر (MUSLIM-THINKER) پر تنقید و تبصرہ کو موضوع خطاب رکھا جائے۔ لیکن میں نے اس سے اختلاف کی جرأت کی جس کی وجہ بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ پاکستان ایک آئیڈیالوجیکل اسٹیٹ (نظریاتی مملکت) ہے اور اس کی درسگاہوں میں (بالعموم) مسلم طلباء تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ بنابریں میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ہمارے مسلم طلباء جو مضمون بھی پڑھیں، انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اسلام کا اس مضمون سے کیا تعلق ہے اور اسے

اس کے نظریاتی نقشہ میں کیا مقام حاصل ہے۔ آپ نے کسی "مسلم مفکر" پر محاکمہ کو موضوع خطاب تجویز کیا۔ لیکن میرے نزدیک، سب سے پہلے دیکھنے اور سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اسلام میں "فکر" (REASON یا THOUGHT) کی گنجائش بھی ہے یا نہیں؟ اس لئے کہ ہمیں بتایا یہ جاتا ہے کہ "مذہب" کی بنیاد ایمانیات پر ہوتی ہے۔ اور ایمان (FAITH) اور فکر (REASON) دو متضاد چیزیں ہیں۔ ایمان، کسی بات کو بلا سوچے سمجھے مان لینے کو کہتے ہیں۔ لہٰذا، اگر بات فی الواقعہ یہی ہے، تو پھر "مسلم مفکر" کی تو اصطلاح ہی جمع بین النقیضین ہے۔ یہ دو الفاظ (SELF - CONTRADICTORY) ہیں۔ اگر وہ مسلم ہے تو مفکر نہیں ہو سکتا اور اگر وہ مفکر ہے تو مسلم نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر یہ نظریہ صحیح نہیں، یعنی اسلام اور فکر باہم گر متضاد حقیقتیں نہیں، تو پھر اگلا سوال یہ سامنے آئے گا کہ کیا اسلام میں فکر کا میدان لامحدود ہے یا اس کی کچھ حدود مقرر ہیں۔ اگر اس کی جولانگاہ لامحدود ہے، تو پھر ایک (SECULAR THINKER) اور (MUSLIM THINKER) میں کوئی فرق نہیں ہو سکتا۔ اور اگر اس کے لئے کچھ حدود و قیود ہیں تو وہ کیا ہیں اور انہیں کس نے متعین کیا ہے۔

یہ ہیں، عزیزانِ من! وہ وجوہات جن کی بنا پر میں نے مناسب سمجھا کہ سب سے پہلے اس موضوع کو لیا جائے کہ اسلام میں فکر کی گنجائش ہے یا نہیں۔ اور اگر ہے تو کس حد تک۔ مجھے امید ہے کہ میری اس وضاحت کے بعد آپ مجھ سے متفق ہو نگے کہ یہ بنیادی موضوع زیادہ موزوں ہے۔ اس تمہید کے بعد آپ اصل موضوع کی طرف آیئے۔

"مذہب" کے متعلق یہ سمجھنا بالکل صحیح ہے کہ اس میں چند عقائد کو بلا سوچے سمجھے، آنکھیں بند کر کے مان لینا ہوتا ہے۔ اس میں عقل و فکر، غور و تدبر، دلیل و برہان کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب اور سائنس میں مستقل نزاع، اور (FAITH) اور (REASON) میں مسلسل جنگ چلی آ رہی ہے۔ لیکن اسلام، میرے عزیزو! مذہب ہے ہی نہیں۔ یہ دین ہے۔ دین، قانون (LAW) کو کہتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ قانون کی بنیاد ہی علم و بصیرت اور دلیل و برہان پر ہوتی ہے۔ سنیئے، کہ اس باب میں قرآن کریم کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ۔ جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگا کرو۔ یہاں سے یہ سوال پیدا ہو گا کہ علم کہتے کسے ہیں؟ قرآن، اس سوال کا جواب ہماری قیاس آرائیوں پر نہیں چھوڑتا۔ خود ہی جواب بھی دیتا ہے کہ بات ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا ہو جائے۔ وہ کہتا ہے کہ یاد رکھو۔ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ

عَنْهُ مَسْئُوْلًا۔ (۱۷/۳۶) تمہاری سماعت، بصارت، اور قلب سے اس کے متعلق پوچھا جائے گا (کہ انہوں نے اس بات کے صحیح ہونے کی شہادت دی تھی؟)

یہ آیت، علم کی دنیا میں ایک عظیم حقیقت کی آئینہ دار ہے۔ انسانی حواس (SENSES) باہر کی دنیا کے متعلق کچھ اطلاعات بہم پہنچاتے ہیں۔ اسے (SENSE-DATA) یا مدرکات (PERCEPTUAL-KNOWLEDGE) کہتے ہیں۔ یہ اطلاعات انسانی قلب (MIND) کے سامنے جاتی ہیں تو وہ اس سے ایک نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ اور اس قسم کے نتائج سے تصورات قائم کئے جاتے ہیں۔ اسے (CONCEPTUAL KNOWLEDGE) کہتے ہیں۔ لہٰذا، قرآن کریم نے اس ایک مختصر سی آیت میں علم کی اہمیت اور اس کی تعریف (DEFINITION) اور تشریح نہایت جامع انداز میں بیان کر دی۔ اور لوگوں سے کہا کہ جس بات کا تمہیں اس طرح علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگا کرو۔ دوسرے مقام پر وہ اسی کی وضاحت میں کہتا ہے کہ جو لوگ اس طرح اپنے حواس اور علم و بصیرت سے کام نہیں لیتے، وہ جہنمی ہیں۔ آیت یہ ہے۔

وَ لَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ۔ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا۔ وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا۔ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ۔ (۷/۱۷۹)

مطلب اس کا یہ ہے کہ وہ لوگ جن کی کیفیت یہ ہے کہ ان کی آنکھیں ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے، کان ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے، سینے میں دل بھی رکھتے ہیں لیکن اس سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے، یہ اہل جہنم ہیں۔ ان کی محض شکل و صورت انسانوں جیسی ہے۔ ورنہ وہ انسان نہیں حیوان ہیں، بلکہ ان سے بھی گئے گذرے۔

آپ نے غور کیا کہ سماعت و بصارت اور قلب سلیم سے کام نہ لینے والوں کے متعلق قرآن کا فیصلہ کیا ہے؟ اس آیت میں اس نے انہیں حیوان کہا ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ۔ (۸/۲۲) خدا کے نزدیک ساری مخلوق میں سے بدترین وہ لوگ ہیں جو عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔ ایک جگہ وہ کہتا ہے کہ جب اہل جہنم جہنم میں پہنچیں گے تو وہاں کے محافظان سے پوچھیں گے کہ تم نے بالآخر وہ کونسا جرم کیا تھا جس کی وجہ سے تم یہاں آ گئے۔؟ سوال آپ نے سن لیا۔ اب ان کا جواب سنئے:۔

وَ قَالُوْا۔ لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ (۶۷/۱۰)

وہ کہینگے، جو کچھ ہم سے کہا جاتا تھا اگر ہم اسے غور سے سنتے اور عقل وفکر سے
کام لیتے تو ہمارا شمار کبھی اہل جہنم میں نہ ہوتا۔

"ہمارا جرم یہی ہے کہ ہم نے غور وتدبر اور عقل وفکر سے کام نہ لیا"۔ اسی قسم کے لوگوں کے متعلق نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ ۔ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَ لَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ. کیا تو ایسے بہروں کو سنا سکے گا، جو عقل سے کام نہیں لیتے ؟ ۔ اَفَاَنْتَ تَهْدِى الْعُمْىَ وَ لَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ۔ (۱۰/۴۳) کیا تو ایسے اندھوں کو راستہ دکھا سکے گا جو آنکھیں کھول کر دیکھنا ہی نہیں چاہتے ؟

یہ اس لئے کہ حضورؐ کی دعوت علیٰ وجہ البصیرت تھی اور جو دعوت عقل وبصیرت پر مبنی ہو اس سے استفادہ وہی کر سکتا ہے جو عقل وبصیرت سے کام لے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے کہ حضورؐ سے کہا گیا کہ ان سے کہدو کہ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْ ۔ یہ ہے میرا راستہ ۔ اَدْعُوْا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۔ (۱۲/۱۰۸) میں جو تمہیں خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں تو یہ دعوت علم وبصیرت پر مبنی ہوتی ہے۔ میرا بھی یہی طریق ہے اور جو لوگ میرا اتباع کریں گے ان کا طریق بھی یہی ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اس دعوت کی مخالفت کرتے تھے، ان سے کہا جاتا تھا کہ میں تم سے کوئی بات دھاندلی سے نہیں منوانا چاہتا، دلیل وبرہان کی رو سے منوانا چاہتا ہوں۔ تم اگر اسے صحیح نہیں سمجھتے تو هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۔ (۲/۱۱۱)۔ تم بھی اس کے مقابل میں دلیل وبرہان لاؤ۔ کذب وصداقت (جھوٹ اور سچ) کا فیصلہ دلیل وبرہان سے ہوتا ہے۔ یہ نہ اندھی عقیدت سے ہوتا ہے نہ دھاندلی سے۔

عزیزانِ من! جو کچھ میں نے اس وقت تک کہا ہے اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ اسلام کے ہر دعویٰ کی بنیاد عقل وفکر پر ہے۔ قلتِ وقت مانع ہے ورنہ میں قرآن کریم سے اسی نہج کی اور متعدد آیات پیش کرتا۔ لیکن آخر میں صرف ایک آیت پر اکتفا کروں گا۔ اور آپ دیکھیں گے کہ وہ آیت ایسی قولِ فیصل اور یوں سمجھئے کہ حرفِ آخر ہے کہ اس کے بعد اس سلسلہ میں کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہیگی

حضورؐ نے ان لوگوں کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرنے میں ایک عمر گذار دی۔ اس نظامِ زندگی کی تفصیلات بڑی شرح وبسط سے بیان فرمائیں۔ ایک ایک گوشے کی جزئیات تک کو سامنے لائے۔ لیکن آخر میں آپؐ نے ان سے کہا کہ دیکھو بھئی ! اِنَّمَا اَنَا اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۔۔۔

میں تم سے صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔

صرف ایک بات، آپ سوچئے عزیزم! کہ وہ بات کس قدر جامع، بنیادی اور اہم ہوگی جس میں حضورؐ کا سارا پیغام سمٹ کر سامنے آجاتا تھا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ ۔ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَ

فُرَادیٰ ـــ وہ بات بڑی توجہ سے سننے کی ہے۔ اس کے لئے تم (سب کے سب نہیں تو کم از کم، ایک ایک، دو دو، کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ خدا کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔ اور اس کے بعد حضورؐ نے وہ ایک بات کہی۔ وہ بات صرف ایک لفظ میں کہہ دی گئی۔ آپ نے فرمایا۔ ثُمَّ

تَتَفَكَّرُوا

تم سوچا کرو۔ غور و فکر کیا کرو!

میں سمجھتا ہوں کہ اس کے بعد اس سلسلہ میں مجھے بھی کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں!

یہ ہے عزیزانِ من! اسلام میں فکر کا مقام!

اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس فکر کا میدان غیر محدود ہے یا کسی خاص حدود کے اندر رہتے ہوئے ہی فکر کی گنجائش ہے؟ تفصیل اس جواب کی طول طویل ہے لیکن میں مختصر الفاظ میں اتنا کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ اس کے لئے ویسے ہی کچھ حدود مقرر ہیں جیسے ایک سائنسدان کے لئے فکری حدود متعین ہوتی ہیں۔ ایک سائنٹسٹ کے سامنے، فطرت کے قوانین ہوتے ہیں جو غیر متبدل ہیں۔ وہ ان قوانین کی حدود کے اندر رہتے ہوئے ہی اپنی فکر میں آزاد ہوتا ہے۔ اگر وہ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے فکر سے کام نہیں لیتا تو اسے بھی سائنٹسٹ نہیں کہہ سکتے۔ اور اگر وہ ان قوانین سے اعراض برتتا ہے یا تجاوز کرتا ہے، تو بھی وہ سائنٹسٹ نہیں کہلا سکتا۔ فطرت کے یہ قوانین خارجی دنیا سے متعلق ہوتے ہیں۔ لیکن انسانی دنیا کے لئے بھی کچھ قوانین ہیں۔ انہیں کلمات اللہ یا مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہا جاتا ہے۔ قوانینِ فطرت کی طرح یہ قوانین بھی غیر متبدل ہوتے ہیں۔ اس حقیقت کو بھی اسی مقام پر سمجھ لیجئے کہ فطرت کے قوانین سائنسدان (یا کسی اور انسان کے) بنائے ہوئے نہیں ہوتے، وہ خدا کے متعین کردہ ہوتے ہیں۔ سائنٹسٹ ان قوانین کو وضع نہیں کرتا، بلکہ صرف (DISCOVER) کرتا ہے۔ وہ کتابِ فطرت کو لکھتا نہیں، اسے پڑھتا ہے۔ اسی طرح یہ مستقل اقدار بھی انسانوں کی وضع کردہ نہیں ہوتیں۔ خدا کی متعین کردہ ہوتی ہیں۔ سائنٹسٹ ان قوانین کو اپنے تجربات (TRIAL AND ERROR) کے ذریعے دریافت کرتا ہے۔ لیکن انسانی زندگی سے متعلق مستقل اقدار کا علم وحیؔ کی رُو سے دیا جاتا ہے۔ (وحی کا موضوع الگ ہے اور اس کی تفصیل میں جانے کا یہ مقام نہیں۔ اس وقت آپ کے لئے اتنا سمجھ لینا ہی کافی ہوگا کہ قوانینِ فطرت کی طرح مستقل اقدار بھی خدا کی متعین کردہ اور غیر متبدل ہوتی ہیں۔ یہ اقدار اپنی مکمل شکل میں، قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے۔

تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۶/۱۱۶)
تیرے رب کے یہ قوانین جو صدق و عدل پر مبنی ہیں، ہر اعتبار سے مکمل ہو گئے۔
ان میں کوئی رد و بدل نہیں ہو سکتا۔

اس مقام پر آپ کے دل میں یہ سوال پیدا ہو گا کہ ان (مستقل اقدار) کو کس طرح مانا جائے گا؟ اور اس کا جواب یہ ہے کہ اسی طرح، جیسے قوانینِ فطرت کو مانا جاتا ہے۔ انہیں علم و بصیرت، غور و فکر اور دلائل و براہین کی رُو سے مانا جائے گا۔ اور جب ان پر عمل کیا جائے گا تو ان کے نتائج، ان کی صداقت کی شہادت بنتے جائیں گے۔ اس پر شاید آپ یہ کہیں کہ پھر "ایمان" کا مقام کونسا ہے؟ اس سلسلہ میں میری مشکل پھر وہی ہے کہ یہ موضوعات بڑے تفصیل طلب ہیں اور آپ نے اس خطاب کے لئے وقت بہت کم رکھا ہے۔ اس وقت میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ "ایمان" کا ترجمہ (FAITH) نہیں (CONVICTION) ہے۔ ہماری سب سے بڑی دشواری یہی ہے کہ اسلام (جو ایک دین ہے) کی اصطلاحات کا ترجمہ "مذہب" کے الفاظ میں کر دیا گیا ہے یہی وہ بنیادی غلطی ہے جس کی وجہ سے اسلام کا صحیح تصور ہمارے سامنے آنے ہی نہیں پاتا اور ہمارا ذہن طرح طرح کے شکوک و شبہات کی آماجگاہ بنا رہتا ہے۔ ایمان (CONVICTION) کا دوسرا نام ہے اور یہ ظاہر ہے کہ (CONVICTION) پیدا ہی پورے پورے غور و فکر سے ہوتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ ذہن اور قلب کا کامل اطمینان ہوتا ہے۔ جسے اس طرح پورے غور و خوض کے بعد علم و بصیرت کی بنا پر اس حقیقت پر یقین آجاتا ہے، اسے مومن کہتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم نے مومنین کی بنیادی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ۔

اَلَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ۔ (۲۵/۷۳)
یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے آیاتِ خداوندی پیش کی جاتی ہیں تو
یہ ان پر بھی بہرے اور اندھے بن کر نہیں گر پڑتے۔

ان پر آنکھیں کھول کر ایمان لاتے ہیں۔

ان تصریحات سے عزیزانِ من! یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہو گی کہ "مسلم مفکر" اسے کہیں گے جو ان مستقل اقدار کی حدود کے اندر رہتے ہوئے، مسائلِ حیات پر غور و فکر کرے۔ یہی ہمارے لئے اس بات کے پرکھنے کا معیار ہو گا کہ فلاں مفکر کی فکر کس حد تک اسلامی ہے۔ یہ حدود ہمیشہ غیر متبدل رہیں گی لیکن ان کے دائرے کے اندر کی گئی فکر، قابلِ تغیر و تبدل ہو گی۔ ثبات و تغیر کے اسی امتزاج کا نام اسلامی فکر ہے علامہ اقبال رح نے اس عظیم حقیقت کو اپنے خطبات میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلّی کی روحانی اساس ازلی و ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصوّر پر متشکل ہو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر عناصر میں تطابق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل، اور ابدی اصول ہوں اس لئے کہ اس، ہر آن بدلنے والی، دنیا میں ابدی اصول ہی وہ ٹھوس بنیاد ہیں جس پر ہم اپنے پاؤں ٹکا سکتے ہیں۔ لیکن اگر ان ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے میں تغیر کا امکان ہی نہیں..... تو اس سے زندگی جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے یکسر جامد بن کر رہ جائے گی سیاسی اور معاشرتی دنیا میں یورپ کی ناکامی، اول الذکر اصول کی صداقت کی شہادت ہے اور اسلام جس طرح گذشتہ پانچ صدیوں میں منجمد بن کر رہ گیا ہے، ثانی الذکر اصول کی شہادت۔

یہی وہ حقیقت ہے جسے انہوں نے دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ؎

یہاں مرض کا سبب ہے غلامی و تقلید
وہاں مرض کا سبب ہے نظامِ جمہوری
نہ مشرق اس سے بری ہے نہ مغرب اس سے بری
جہاں میں عام ہے قلب و نظر کی رنجوری!

ثبات نہ ہو تو قوموں کی حرکت، سفر نہیں، آوارگی بن کر رہ جاتی ہے۔ اور اگر تغیر نہ ہو تو انسان، ممی شدہ لاش سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ یہ تعینِ منزل کے بعد حرکت ہی ہے جس سے قوموں کی تقدیریں صبح و شام بدلتی رہتی ہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے حضورؐ نبی اکرمؐ نے ان بصیرت افروز الفاظ میں جلوہ بار فرمایا ہے کہ۔

مَنِ اسْتَوٰی یَوْمَاہُ فَھُوَ مَغْبُوْنٌ۔

جس کے دو دن ایک جیسے گذر گئے (یعنی آج جس کا قدم گزشتہ کل کے مقابلہ میں آگے نہ بڑھا) وہ سخت نقصان میں رہا۔ عزیزانِ من! اللہ تمہیں اس کی توفیق عطا کرے کہ تم قوم کا امروز (آج) دوش (گذشتہ کل) سے روشن تر کر دو کہ تم میں سے ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

(والسلام)

پنجاب یونیورسٹی کا شعبۂ اسلامیات

ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں علوم اسلامیہ یا اسلامیات کی تعلیم کے جو حوصلہ شکن نتائج سامنے آئے ہیں' ان کی نسبت آئے دن اخبارات میں کچھ نہ کچھ لکھا جاتا ہے اور اس تعلیم کو مفید بنانے کے لئے مختلف تجاویز پیش کی جا رہی ہیں۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اس معاملے میں زیادہ دلچسپی مغربی تعلیم یافتہ حضرات لے رہے ہیں۔ "علمائے کرام" جن پر اس بارے میں زیادہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے' کی طرف سے ابھی تک کوئی مثبت تجویز یا مشورہ سامنے نہیں آیا۔ اس سلسلے میں جو مضامین میری نظر سے گزرے ہیں' ان میں جناب ایم محمد افضل حسین صاحب کے تجزیہ نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اور یہی تجزیہ ان سطور کا محرک ہے۔ ان کا یہ تجزیہ روزنامہ "پاکستان ٹائمز" کی ۱۱ اور ۱۲ اپریل ۱۹۶۷ء کی اشاعتوں میں شائع ہو چکا ہے۔ مختصر الفاظ میں ان کے تجزیہ کا خلاصہ یہ ہے کہ کالجوں میں اسلامیات کی تعلیم کے مثبت نتائج نکلنے کی بجائے الٹا ہمارا نوجوان طبقہ اسلام سے بیزار ہو رہا ہے۔ انہوں نے اپنے اس تجزیہ کی تائید میں پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات کے صدر (علاؤالدین صدیقی صاحب) کے مندرجہ ذیل ارشادات بھی نقل کئے ہیں جو انہوں نے جنوری ۱۹۶۰ء میں حیدرآباد میں منعقد ہونے والی بارہویں آل پاکستان سائنس کانفرنس کے موقع پر فرمائے تھے۔

> علوم اسلامیہ یا اسلامیات کی تعلیم کے موجودہ نظام پر ایک نظر ڈالنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ بے مقصد، بے اثر اور فضول محض ہے۔ عوام کی ضروریات پوری کرنے اور دائرۂ مذہب میں تعمیری لیڈرشپ پیدا کرنے کی بجائے اس اسلامیات سے' عامۃ الناس کے ذہن افراتفری کا شکار ہو رہے ہیں۔ اسے محض عوام کے جذبات کی تسکین کے لئے برقرار رکھا جا رہا ہے۔ اس کے لئے مناسب طریقے اور پلاننگ پر عمل نہیں کیا جا رہا۔ اس کے پورے کے پورے نظام

میں انقلابی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ لیکن اس انقلاب سے پہلے ضروری ہے کہ اس کے نصب العین کا تعین کیا جائے اور اس نصب العین کے حصول کے لئے پلاننگ کیا جائے۔

(پاکستان ٹائمز۔ راولپنڈی صفحہ ۴۔ مورخہ ۱۲ اپریل ۱۹۹۶ء)

شعبہ اسلامیات کے صدر کے یہ الفاظ سنکر کہ ابھی تک اس مضمون کے پڑھانے کے مقاصد تک متعین نہیں ہوئے، ہم ورطۂ حیرت میں گم ہو گئے کہ جب اس شعبہ کے ارباب حل و عقد کے سامنے اس کا کوئی مقصد نہیں تو اس کی ناکامی کی ذمہ داری کس پر عاید ہوتی ہے! لیکن حیرت اندر حیرت یہ کہ اس نظام کی ناکامی کا ایسا واضح اعلان کرنے کے باوجود اس عرصہ میں خود ان حضرت (صدر شعبۂ اسلامیات) کی طرف سے بھی کسی قسم کی کوئی ایسی تجویز سامنے نہیں آئی جو اس کی تلافی کر سکے۔ تلافی کی کوشش تو کجا' ان کے مذکورہ بالا ارشادات کے بعد اسلامیات کی اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں کچھ ایسے اقدامات کئے گئے ہیں جس نے اسے مزید ناکامی کا شکار بنا دیا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے بنیادی اقدام علوم اسلامیہ کی اعلیٰ تعلیم سے **عربی زبان کا اخراج** ہے۔ آج سے دو تین سال پہلے ایم۔اے اسلامیات کے لئے بی۔اے میں عربی زبان کا مضمون لینا لازمی تھا۔ اب اس پابندی کو بھی ختم کر دیا گیا ہے۔ اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ بی۔اے اسلامیات کے نصاب میں بھی کچھ ایسی تبدیلی کی گئی ہے کہ عربی زبان کا تعلق ہی کم ہو جائے۔ اس نصاب میں قرآن کے پرچے میں سے قرآن مجید کا نصف نصاب ختم کر دیا گیا ہے۔ اور اس کی بجائے جماعت اسلامی کے ایک اہل قلم کی کتاب "اسلامی نظریۂ حیات" داخل نصاب کر دی گئی ہے۔ یعنی پہلے ...... قرآن مجید سے متعلق پرچہ کی تیاری کے لئے جس قدر عربی زبان سے واقفیت ضروری تھی' اُسے بھی اب نصف کر دیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ اس وقت بی۔اے اسلامیات کا قرآنی نصاب ایف۔اے اسلامیات کے مقابلے میں نصف ہے۔ حالانکہ اس کو کم از کم دُگنا ہونا چاہئے تھا' کیونکہ بی۔اے میں طلباء کو ایف۔اے کی نسبت دو مضمون کم تیار کرنے ہوتے ہیں۔

اسلامیات سے "عربی زبان کے اخراج" کے "انقلابی فیصلے" کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے اسلامیات کی سب سے اعلیٰ تعلیم کے طلباء کا سارا دارومدار اُردو کی کتابوں پر رہ گیا۔ اس طرح ان کا رشتہ دین کے اصلی ماخذ سے یکسر منقطع ہو گیا۔ باقی رہیں اُردو کی کتابیں' سو آجکل "دین" سے متعلق اردو کی کتابیں جماعت اسلامی ہی کی بنائی جا سکتی ہیں۔ چنانچہ اس کی اولین مثال خود جماعت اسلامی کی کتاب کے داخل نصاب ہو جانے کی ہے۔ اس جماعت کی حالت یہ ہے کہ اگر کوئی جدید تعلیم یافتہ نوجوان دین کے متعلق

کوئی بات کرتا ہے تو یہ جھٹ سے اعتراض کر دیتے ہیں کہ تم عربی زبان سے واقف نہیں اس لئے تمہیں مذہب سے متعلق بات کرنے کا کیا حق ہے؟ اور اپنی حالت یہ ہے کہ ان کے یہ "ماہرین اسلامیات" سب عربی زبان سے کورے ہوتے ہیں۔ آپ نے غور فرمایا کہ "اسلامیات" کے نام سے یہاں کیا سیاسی کھیل کھیلا جا رہا ہے؟ ـــــ طلوع اسلام کا یہ تجزیہ کتنا حقیقت پسندانہ تھا کہ اسلامیات کا نظامِ تعلیم کچھ اس ڈھنگ سے ترتیب دیا گیا ہے کہ یہ ملک کے کالجوں میں جماعتِ اسلامی کے لئے اڈے فراہم کر رہا ہے۔

ناکامی کا ذمہ دار کون ہے؟

اسلامیات کی موجودہ تعلیم قوم و ملک کی امنگوں کو پورا نہیں کر رہی۔ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ علوم اسلامیہ کے صدر نے یہ ارشاد فرما کر اس ناکامی کی ذمہ داری دوسروں کے کندھوں پر ڈالنے کی کوشش کی، لیکن یہ دیکھنے کے لئے کہ اس ناکامی کی ذمہ داری میں کون شریک ہیں ہم تھوڑی سی تفصیل پیش کرتے ہیں۔

ایم۔اے اسلامیات کے امتحان میں ایک اہم پیپر کسی اسلامی عنوان پر تحقیقی مقالہ کی تیاری ہے جو یونیورسٹی کے اساتذہ کے مشورہ اور رہنمائی سے تیار کیا جاتا ہے۔ ان تحقیقی مقالات کی اہمیت کی وجہ سے اکثر و بیشتر پنجاب یونیورسٹی کی سالانہ رپورٹوں میں ان کی فہرست شائع کی جاتی ہے۔ اب تک سینکڑوں کیا بلکہ ہزارہا ایسے تحقیقی مقالات شعبۂ علوم اسلامیہ کی نگرانی میں تیار کئے جا چکے ہیں۔ لیکن آپ حیران ہوں گے، کہ ان سینکڑوں ہزاروں عنوانوں میں وہ عنوان آپ کو کہیں نظر نہ آئیں گے جن کا تعلق ہمارے ملک کے عملی مسائل سے ہے۔ اگر اسلامیات کے منتہی طالب علم ان مسائل کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقی مقالے تیار کرتے تو یہ حقیقت ان پر روشن ہو جاتی کہ یہاں کس طرح ان مسائل کو سیاسیات کا شکار بنایا جا رہا ہے۔ اور ساتھ ہی ان لوگوں کے تحقیقی مقالے عامۃ الناس کی صحیح رہنمائی کرتے۔ لیکن اس وقت معاملہ بالکل اس کے الٹ ہے۔ ہمارے اسلامیات کے منتہی طالب علم جو تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اکثر و بیشتر کالجوں میں لیکچرار ہوتے ہیں، دین کے اصل مآخذ سے ناواقفیت کی وجہ سے خود ان سیاسی طالع آزماؤں کی سیاست کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اسلامیات کے طالب علم تو ایک طرف، ان کے اساتذہ تک کا بھی کوئی تحقیقاتی مقالہ آج تک منظرِ عام پر نہیں آیا۔ حتیٰ کہ صدر شعبۂ اسلامیات کی اپنی تحقیق کا بھی کوئی نمونہ سامنے نہیں آیا۔ ایک صاحب جو "علامہ ابن قیم" پر پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہے تھے، ان سے جب یہ پوچھا گیا کہ علامہ ابن قیم نے خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں بھی کچھ لکھا ہے تو وہ پوچھنے والے کا منہ تکتے رہ گئے۔ حالانکہ سلف صالحین میں سے علامہ ابن قیم نے اپنی ایک بہت ہی اہم کتاب میں اس مسئلہ پر بڑی سیر حاصل بحث

کی ہے۔

اصلاح کی تجاویز

یونیورسٹی کے تمام مضامین میں سے اس وقت علوم اسلامیہ کے مضمون کو سب سے زیادہ آسان سمجھا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ بھی دوسرے مضامین کی نسبت ہمیشہ "شاندار" ہی ہوتا ہے۔ یعنی دوسرے مضامین میں جہاں چالیس سے پچاس فیصد تک طالب علم کامیاب ہوتے ہیں، وہاں اس مضمون میں نوّے سے پچانوے فیصد تک بلکہ بعض اوقات یہ نتیجہ سو فیصد تک جا پہنچتا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کی ۶۵-۱۹۶۴ء کی سالانہ رپورٹ میں یہ نتیجہ سو فیصد دکھایا گیا ہے۔ یعنی جماعت اسلامی کا شعبہ جمعیت طلبا اپنے طالب علم بھیجتا چلا جاتا ہے اور وہاں سے ہر ایک کو پروفیسر اسلامیات بنا کر باہر کالجوں میں بھیج دیا جاتا ہے۔

آخر میں ہم چند ایک تجاویز پیش کرنے کی جرأت کرتے ہیں جن سے ہماری رائے میں یہ مضمون کسی حد تک معیاری بن سکتا ہے۔ اور اس کے بعد اس تجربہ کی روشنی میں اس کے معیار کو رفتہ رفتہ اور بلند کیا جا سکتا ہے جس سے یہ مضمون قوم و ملک کے لئے مفید ثابت ہو۔

۱۔ عربی زبان پر کامل عبور

اسلامیات کے منتہی طالب علم کو عربی زبان پر مکمل عبور حاصل ہو تاکہ وہ قرآن و حدیث اور اسلامی علوم کی اصل عربی کتب کا براہ راست مطالعہ کر سکے۔ ویسے بھی عربی زبان کے بغیر اسلامیات کا تصور کچھ عجیب عجیب سا لگتا ہے۔

(۱) ایم۔ اے اسلامیات کے لئے پہلے کی طرح بی۔ اے میں عربی زبان کا مضمون لینا لازمی ہو۔

(۲) بی۔ اے میں اسلامیات کا نصاب، ایف۔ اے اسلامیات کے نصاب سے کم از کم دگنا ہو۔

(۳) ایم۔ اے اسلامیات میں ایک پرچہ عربی زبان کے لئے مخصوص ہو۔ اس پرچہ کا معیار ایسا ہونا چاہیئے کہ طالب علموں میں اتنی استعداد پیدا ہو جائے کہ وہ اسلام کے دینی سرمایہ کو اسکی اصل زبان میں سمجھ سکیں۔ ہمارے علماء نے عربی زبان کو ایک ہوّا بنا رکھا ہے۔ اس زبان کو اگر سائنٹفک طریق سے پڑھایا جائے تو اس میں بڑی آسانی سے ملکہ حاصل ہو جاتا ہے۔ میرے خیال میں ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے شائع شدہ کتاب "عربی خود سیکھیئے" عربی گرامر کی عام کتابوں کی نسبت زیادہ مفید ثابت ہو گی۔

۲۔ قرآن مجید کا مکمل ترجمہ

ایم۔ اے اسلامیات کا ایک پرچہ پورے قرآن مجید پر مشتمل ہونا چاہیئے۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ ایم۔ اے انگلش میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے کے لئے بالواسطہ طور پر بائیبل کو مستحق غور و فکر سمجھا جائے لیکن اسلامیات

کے مضمون میں پورے قرآن مجید کا ترجمہ تک بھی داخلِ نصاب نہ ہو۔ اس وقت نصاب میں قرآن مجید کی جو چند سورتیں داخلِ نصاب ہیں، ان کو عام طور پر رٹ لیا جاتا ہے۔ لیکن جب سارا قرآن مجید تیار کرنا ہوگا، تو یہ "رٹے" والا سہارا ختم ہو جائے گا۔ اور طالب علموں میں مناسب قابلیت پیدا ہو جائیگی۔

۳۔ حدیث شریف کا پرچہ

اس وقت حدیث کے پرچہ میں مشکوٰۃ شریف میں سے کتاب الصلوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ، اور کتاب الصوم کی پہلی پہلی فصل داخلِ نصاب ہے۔ کتنی عجیب سی بات ہے کہ ایم۔ اے اسلامیات کے طالب علموں کو صرف وہی چند مسائل پڑھائے جائیں جن کی چوتھی جماعت کے طالب علم سے توقع کی جاتی ہے۔ اس پرچہ میں کم از کم اتنا نصاب ہونا چاہیئے کہ اسلامیات کے منتہی طالب علم کو سچی اور جھوٹی حدیث کی عملی پہچان ہو سکے۔ حدیث کی کئی ایسی مختصر کتابیں ہیں جو اس ضرورت کو کما حقہٗ پورا کر سکتی ہیں۔ ہمارے خیال میں امام ابن تیمیہ کے جدامجد کا مجموعہ "منتقی الاخبار" (جو تقریباً چار صد صفحات پر مشتمل ہے) ان میں سب سے عمدہ ہے۔ یہ کتاب ایم۔ اے کے دو سالوں میں آسانی سے تیار ہو سکتی ہے۔ اس کتاب کے ساتھ ایک آسانی یہ بھی ہے کہ اس کی ایک بہت ہی عمدہ شرح "نیل الاوطار" موجود ہے۔ جس سے اساتذہ استفادہ کر کے طلباء کی مناسب رہنمائی کر سکتے ہیں۔ اس کتاب کی اچھی طرح تیاری سے صحیح اور ضعیف احادیث کے پرکھنے کی مناسب استعداد پیدا ہو جائے گی۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ اس وقت ہمارے ملک میں حدیث شریف کے ساتھ عجیب و غریب سلوک ہو رہا ہے۔ اگر کوئی جھوٹی حدیث کسی کے مسلک کی تائید کرتی ہو تو اس کا سہارا لے لیا جاتا ہے۔ اور اس کے مقابلے میں اگر صحیح حدیث سے کوئی بے نقاب ہوتا ہو، تو اس کا انکار کر دیا جاتا ہے۔

۴۔ فقہ کا مفصّل مطالعہ

اس وقت ایم۔ اے کے نصاب میں حنفی فقہ کے مطابق نکاح، طلاق اور فرائض کے مسائل شامل ہیں۔ یہ محدود نصاب کسی طور ایم۔ اے کے طالب علموں کے شایانِ شان نہیں۔ یہی تو وہ میدان ہے جس نے اسے "دینی لیڈر شپ" کے لئے تیار کرنا ہے۔ یہ میدان اس وقت مکمل طور پر قدامت پسند علماء کے ہاتھ میں ہے۔ اور وہ جس طرح چاہتے ہیں اسے استعمال کرتے ہیں اور اس معاملے میں ہمارے اسلامیات کے فارغ التحصیل طالب علم بھی اکثر و بیشتر انہی کے پیچھے چلنے پر مجبور ہیں۔ فقہ کا مطالعہ صرف حنفی فقہ تک محدود نہیں رہنا چاہیئے بلکہ امت مسلمہ کے تمام مشہور ائمہ کے مسالک سامنے آنے چاہئیں۔ ہم نے اسلامیات کے نصاب میں دنیا کے تمام مذاہب کا مطالعہ تو گھسیڑ رکھا ہے لیکن خود اپنے ائمہ کے مختلف مسالک سے

سرد مہری برتی گئی ہے۔ اگر مندرجہ ذیل دو میں سے کوئی ایک کتاب بھی فقہ کے پرچہ میں شامل کیجائے تو نتائج انشاءاللہ زیادہ شاندار ہونگے۔

(۱) اَلْمِیْزَانُ الْکُبْرٰی ۔ از علامہ شعرانی

(۲) بِدَایَۃُ الْمُجْتَھِدْ۔ از علامہ ابن رشد

ان دونوں کتابوں میں مختلف ائمہ اسلام کے مذاہب کو بڑی دیانت داری سے پیش کیا گیا ہے۔

نصاب میں اضافہ کا خدشہ

مذکورہ بالا اضافوں سے ایم۔اے اسلامیات کے نصاب میں صرف اتنا اضافہ ہوگا جو اس کو دوسرے مضامین کی سطح پر لے آئے گا۔ اور اسلامیات کے طالب علموں کو بھی دوسرے مضامین کے طالب علموں کی طرح محنت کرنی ہوگی۔ یہ معمولی اضافہ صرف عبوری دور کے لئے ہوگا۔ بعد میں اس تجربہ کی روشنی میں معیار کو اور بھی بلند کیا جا سکتا ہے۔

حرفِ آخر

ہم نے اس سلسلہ میں جو تجاویز پیش کی ہیں وہ موجودہ نظامِ تعلیم کے پیشِ نظر ہیں۔ ورنہ مرض کا اصلی علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ "اسلامیات" کو ایک الگ مضمون رکھنے کے بجائے، سارا نصابِ تعلیم اس طرح بدلا جائے کہ طالب علم جو کچھ پڑھے اس میں اسے اسلام کی روح جھلکتی نظر آئے۔ باقی رہے ہمارے اسلاف کے علمی کارنامے، سو انہیں تاریخ کے طور پر پڑھایا جائے اور فقہ کو لا کالج کا نصاب قرار دیا جائے۔

لیکن جب تک ایسا نہ ہو سکے، اس وقت تک اسلامیات کے موجودہ نصاب کو علمی سطح پر تولا جائے اس وقت تو یہ صرف ایک خاص جماعت کے سیاسی مفاد کے حصول کا آسان ترین آلۂ کار بن کر رہ گیا ہے۔

"شاہد عادل"

ISLAM: A CHALLENGE TO RELIGION

انتہائی مسرت کے ساتھ یہ خوش خبری قارئین تک پہنچائی جاتی ہے کہ پرویز صاحب کی مذکورہ بالا انقلاب آفریں کتاب (بزبان انگریزی) پریس میں چلی گئی ہے۔ اور اندازہ ہے کہ تین ماہ تک آپ کے سامنے آجائے گی۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام

رابطِ باہمی

بزم لاہور سالانہ کنونشن کے انعقاد کے بعد بزم نئے ولولوں کے ساتھ تازہ پروگرام کے مطابق اپنے فرائض کی انجام دہی میں سرگرم ہے۔ مجلہ طلوع اسلام کی اشاعتی سکیم کو آگے بڑھانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ طے کردہ نہج پر تحریک سے متعلق نئے پمفلٹس اور کتب کی اشاعت میں بھی ادارہ کے ساتھ پورا تعاون کر رہی ہے ـــــ محترم پرویز صاحب کا مسلسل درسِ قرآن جو سات سال ہوئے الحمد سے شروع کیا گیا تھا حالیہ رمضان المبارک میں والناس تک پہنچ رہا ہے۔ چونکہ عید کے موقعہ پر یہ بزم ہر سال ایک جشنِ نزولِ قرآن منایا کرتی ہے۔ اس مرتبہ یہ طے پایا ہے کہ اسے تکمیلِ درسِ قرآن کی تقریب کیساتھ ہی ۲ جنوری بروز اتوار نہایت شایانِ شان طریق پر منایا جائے۔

بزم کراچی سندھ اسمبلی ہال میں ہفت وار ٹیپ شدہ درسِ قرآن کے علاوہ بزم نے گزشتہ کنونشن کے تقریباً تمام اہم خطابات کو دوبارہ ٹیپ کر کے کراچی کے متعدد حلقوں میں نئے احباب کو سنانے کا منظم پروگرام بنا رکھا ہے جس سے یہ توقع ہے کہ کراچی میں ان خطابات اور درسِ قرآن کے اجتماعات کی رفتار پہلے سے دگنی ہو جائے گی۔ بزم کی دیگر سرگرمیاں بدستور جاری ہیں۔

بزم لائلپور سالانہ کنونشن کے بعد اراکین نے ایک نئے ولولے سے کام شروع کیا ہے۔ کئی ایک با اثر اصحاب ذوق کی بزم میں شمولیت سے مجلہ طلوع اسلام کی سکولوں اور کالجوں میں اشاعت کے لئے منظم کوشش ہو رہی ہے۔ مفکرِ قرآن کے اہم خطابات، ہفتہ وار درسِ قرآن کے علاوہ باہر کے ذی علم حلقوں میں سنانے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔

دیگر بزمیں اپنی اپنی جگہ تحریک کے فروغ کے لئے سالانہ کنونشن کے بعد نئے جذبہ سے طلوعِ اسلام کے پیام کو پھیلانے میں مستعد ہو گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے نیک ارادوں اور استقامت میں برکت عطا فرمائے۔

معذرت

ہمیں افسوس ہے کہ جگہ کی قلت کی وجہ سے مطالب الفرقان کی قسط زیرِ نظر اشاعت میں نہیں دی جا سکی۔ اس کی تلافی آئندہ کر دی جائے گی۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طلوعِ اسلام کنونشن

بزمِ مذاکرہ ۱۹۶۷ء منعقدہ ہفتہ ۱۱ نومبر

بوقت ۲½ بجے دوپہر

موضوع

آثار بتلاتے ہیں سحر ہو کے رہیگی!

زیرِ صدارت

محترمہ بیگم سکندر ریاض

شرکائے مذاکرہ

(۱) خالد اسلام ——— (پروفیسر انجینئرنگ یونیورسٹی۔ لاہور)
(۲) اختر عباس سعید ——— (استاذ گورنمنٹ ٹیچرز ٹریننگ سکول۔ کوئٹہ)
(۳) (بیگم) ثریا عندلیب ——— (اسلام آباد)
(۴) پرویز رحیم ——— (سٹوڈنٹ، لاء کالج۔ لاہور)
(۵) (عزیزہ) غزالہ خان ——— (سٹوڈنٹ، کنیئرڈ کالج۔ لاہور)
(۶) فرید الدین احمد ——— (سٹوڈنٹ، اسلامیہ کالج۔ لاہور)
(۷) (بیگم) خضر عارفی ——— (ایم۔اے (فلسفہ)، ایم۔اے (اردو))
(۸) سراج منیر ——— (ایم اے (اسلامیات))
(۹) (عزیزہ) عفت خلیل ——— (سٹوڈنٹ۔ لاہور کالج فار ویمن)
(۱۰) دو بچیاں ——— بچہ کوثر۔

سلمٰی پرویز۔

اِفتتاحیہ ـــــ از صدرِ مذاکرہ

معزز حاضرین و عزیز بہنو و بیٹیو!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'۔

مشفق و محترم بھائی جناب پرویز صاحب کے فرمان کی تعمیل میں اس اجلاس کی صدارت مجھے کرنی پڑ رہی ہے۔ جو حسنِ ظن وہ میرے متعلق رکھتے ہیں اس کا شکریہ ادا کرنے کے لئے تو میرے پاس الفاظ بھی نہیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ایک معمولی گھریلو قسم کی عورت ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ ذوق و شوقِ قرآنی ایسی محفلوں میں لے آتا ہے، اور برادر محترم پرویز صاحب کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی میں اظہارِ خیالات کی سعادت حاصل ہو جاتی ہے۔ ایسی محفل جہاں شمع قرآنی کے پروانے جمع ہیں، جہاں عقل و دانش کی تجلیاں ہر سو ہیں۔ جہاں یونیورسٹی کے طلباء و طالبات اور اساتذہ کرام اپنی فہم و بصیرت کے گوہر لٹانے آتے ہیں۔ میرا زبان کھولنا بے معنی سا لگتا ہے پر کیا کروں، اس حوصلہ افزائی کے شکریہ میں کچھ تو کہنا ہی چاہیئے۔

آپ سب جانتے ہیں کہ اس مجلس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ہماری نئی نسل کی حوصلہ افزائی کرتی ہے ہماری طاہرہ بیٹیاں اور سلیم بیٹے اور چند ایک طاہرہ بہنیں اپنے اپنے افکار آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ مذاکرے اور مقالے تو ہر علمی و ادبی محفل کی جان ہوتے ہیں لیکن جو مذاکرے اور مقالے قرآن کریم کی روشنی میں پیش کئے جائیں ان کی بات ہی اور ہے۔

اس بار جو موضوع منتخب کیا گیا ہے وہ ہمارے لئے دعوتِ فکر و عمل ہے "آثار بتاتے ہیں سحر ہو کے رہے گی"۔ اب یہ تو سننے کے بعد ہی فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ کس کس کی نگاہِ بصیرت کہاں کہاں تک گئی؟

اگر سمع خراشی معاف ہو تو میری بھی کچھ سن لیجئے۔ میں کیا کہوں؟ مجھے تو آثار یہ بتاتے ہیں کہ سحر ہو رہی ہے۔ یہ ہمارا اجتماع، یہ ہمارا ذوق و شوق، یہ ہر ہفتہ درسِ قرآن کریم کے لئے کشاں کشاں دور دور سے آنا، یہ ٹیپ کئے ہوئے درس کے لئے والہانہ شوق اور انتظام۔ اور سب سے زیادہ یہ ہمارے طلباء و طالبات، ان

کی علمی سرگرمیاں، تاریخ ادب و سائنس کے ہر میدان میں اِن کے جوشِ عمل کے مظاہرے، قلب و نگاہ کو سرور بخشتے ہیں۔ کیا یہ سب نمودِ سحر نہیں؟ اور دور کیوں جائیں ابھی کی تو بات ہے، ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ ہماری تاریخ کا ایک سنہری باب ہے۔ جو قومیں زندہ رہنا چاہتی ہیں انہیں کوئی مٹا نہیں سکتا۔ ہم نے اتحاد اور ایمان کی قوت کا اثر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔ ہر شب کی ایک سحر ہے اور ہر سحر کی ایک شب۔ یہی گردشِ لیل و نہار ہے لیکن جو قومیں عقل و فکر کے دروازے اپنے اوپر بند کر لیتی ہیں اُن کی سحر کبھی نہیں آتی۔ لیکن جو قومیں عقل و فکر کے چراغ کو روشن رکھتی ہیں اُن کی شب بھی روز روشن کی طرح روشن و تابناک رہتی ہے۔ جب تک ہمارے ہاتھوں میں شمعِ قرآنی ہے اور ہمارے سینوں میں توحید کی امانت ہے، ہمارے لئے نہ حُزن ہے نہ ملال۔ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ اپنے ماضی کو دیکھئے۔ اس لئے نہیں کہ اُس پر بیجا فخر کریں بلکہ اسلئے کہ اُس سے سبق حاصل کریں۔ جو غلطیاں ہوئی ہیں اُن کو پھر نہ دہرائیں۔ ماضی کا نوحہ کرنے سے بھی کچھ حاصل نہیں۔ ماضی، حال، مستقبل سب ایک ہی تصویر کے رُخ ہیں۔

ہماری یہ محفل اس بات کا ثبوت ہے کہ ہمارے دلوں میں شوق ہے، ولولے ہیں، ہم سب کو اپنی منزل نظر آ رہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کسی کو قریب اور کسی کو دور۔ ہمیں صرف ایک چیز کی ضرورت ہے اور وہ ہے یقینِ محکم۔ یہ یقین کہ اگر ہم شمعِ قرآنی کو مضبوط تھام لیں گے اور اُس کی رہنمائی میں سفرِ زندگی طے کرینگے تو وہ سحر جس کی نمود ہو رہی ہے، بہت جلد طلوع ہو جائے گی۔

ہم پر، آپ پر، ہر فرد پر، کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ صرف اپنی اپنی ہی اصلاح ہمارے لئے کافی نہیں ہے ہمیں دوسروں کی اصلاح کا بھی بار بار حکم دیا گیا ہے۔ وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔ مومن کا فریضہ یہ ہے کہ خود بھی حق پر قائم رہے اور دوسروں کو بھی حق پر قائم رہنے اور ثابت قدم رہنے کی ہدایت کرتے رہیں۔ ایک چراغ سے دوسرا چراغ روشن ہوتا ہے اور یوں تاریکیاں روشنیوں میں بدل جاتی ہیں۔

ہماری امیدیں ہماری نئی نسل سے وابستہ ہیں۔ قوم کا سرمایہ اس کے بچے اور نوجوان ہی ہوتے ہیں۔ میں ایک ماں ہوں۔ اور میرے سامنے قوم کے ایسے بے شمار نوجوان ہیں جن کی صلاحیتوں پر مجھے ناز ہے۔ گھریلو مصروفیات کے باوجود مجھے اپنی قوم کے بچوں اور بچیوں سے ہمیشہ گہری دلچسپی رہی ہے اور اپنی عقل و بساط کے مطابق صرف اپنے بچوں کی ہی نہیں ان کے ملنے جلنے والوں کی بھی حوصلہ افزائی اپنا مقدس فرض سمجھتی رہی ہوں۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ مجھے نمودِ سحر کے آثار ہی نظر نہیں آ رہے بلکہ نمودِ سحر میری نگاہوں کے سامنے ہے ہماری نئی نسل بڑی صلاحیتوں کی مالک ہے۔ اُن کی ذہنی سطح ہم سے بلند ہے۔ اور خوش قسمتی سے انہیں اپنی صلاحیتوں کی نشو و نما کے لئے ایسے مواقع بھی حاصل ہیں جن کا ہمارے زمانہ میں تصور بھی نہیں تھا۔ ذہنی

اور علمی طور پر ہماری نئی نسل ہم سے بہت آگے ہے۔ یہ سب ہمارے لئے خوشی کی بات ہے۔ والدین، اولاد کی ترقی سے خوش ہوتے ہیں اُن کو ہمیشہ اپنے سے بہتر و اعلیٰ معیار پر دیکھنے کی آرزو رکھتے ہیں۔ اور ہر ممکن خدمت و سعی سے دریغ نہیں کرتے ۔۔۔ لیکن ۔۔۔ اور اس لیکن پر غور و فکر کی ضرورت ہے۔ دنیا کے نشیب و فراز، معاشرہ میں توازن قائم رکھنے کے اصول یہ کسی اسکول و کالج میں نہیں سکھائے جاتے ہیں اور نہ سکھائے جا سکتے ہیں۔ یہ باتیں تو اُن کی رہنمائی سے طے ہو سکتی ہیں جو خود کامیابی سے اپنا سفر طے کر رہے ہیں یا طے کر چکے ہوں۔ اس میں نہ توہین ہے نہ بے اعتمادی۔ نئی نسل اور پرانی نسل اپنے رشتہ کو توڑ نہیں سکتیں۔ پھر کیوں نہ مل جل کر محبت و اعتماد کی فضا میں اپنا اپنا سفر جاری رکھیں۔

طاہرہ بیٹیاں اور سلیم بیٹے ناراض نہ ہوں اور ایک غمخوار کی نصیحت کو ٹھنڈے دل سے سنکر غور کریں تو وہ ضرور اس کی افادیت کے قائل ہو جائینگے۔ اور مجھے امید ہے کہ وہ ضرور ایسا کریں گے کیونکہ قلبِ سلیم کا تقاضا یہی ہے کہ ضبط و تحمل، غور و فکر سے ہر کام کیا جائے ۔۔۔ آپ اپنا اپنا مقام خود پہچانیئے۔ قرآن کریم ہم سے جس سیرت اور کردار کی بلندی اور پاکیزگی کا مطالبہ کرتا ہے، اس پیمانے سے اپنے کو ناپیئے، اس کسوٹی پر اپنے کو پرکھیئے۔ آپ قوم کی ماؤں، بہنوں و بیٹیوں کی عزت کے رکھوالے ہیں۔ اُن کی عفت و عصمت، اُن کے وقار کے محافظ ہیں۔ آپ نے جنگ میں جس بلند کردار کا مظاہرہ کیا اس کو آپ کی مائیں اور بہنیں فخر و انبساط سے ہمیشہ یاد رکھیں گی۔ اب خدارا ہیرپرستی کی طرف نہ لوٹیئے۔ آپ کے ہاتھوں میں شمع قرآنی ہے اس کی عظمت کو برقرار رکھنا آپ کا مقدس فرض ہے۔ اور طاہرہ بیٹیاں اور بہنیں ۔۔۔ اُن سے بھی کچھ کہنا ہے۔ آج کی بیٹیاں کل کی مائیں ہونگی آپ کی ذمہ داریاں، آپ کے فرائض دوہرے ہیں۔ قرآن کریم ہم سب کے سامنے ہے۔ ہماری عزت اسی سے ہم آہنگی سے قائم رہ سکتی ہے۔ آپ کے لئے بھی کچھ حدود ہیں، کچھ قیود ہیں۔ اُن کو سمجھیئے اور اپنا مقامِ بلند پہچان لیجئے۔ آپ کھلونا نہیں کہ جو چاہے کھیلے، توڑے پھوڑے اور پھینک دے۔ آپ اپنی عزت اور وقار کی خود حفاظت کیجئے۔ اپنے میں خود اعتمادی پیدا کیجئے۔ قوموں کا مستقبل اُن کی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کے ہاتھوں ہی سنورتا اور بگڑتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ آنے والا مورخ آپ کو ہی موردِ الزام ٹھہرائے اور دربار خداوندی میں بھی پشیمانی حصہ میں آئے۔ بے شک ماضی میں آپ پر بہت کچھ ظلم و ستم ہو چکا۔ لیکن یہ تو حال ہے اور آپ سے ماضی کی پوچھ نہ ہوگی آپ کا کام تو حال کو سنوار کر مستقبل کو خوشگوار بنانا ہے۔ ترقی کی راہیں آپ کے سامنے کشادہ ہیں۔ للہ ۔۔۔ عقل و فکر سے کام لیجئے۔ اب اپنے اوپر خود ظلم نہ کیجئے۔ اپنے مقام کو، اس کی عظمت کو، اپنے حقوق و اپنے فرائض کو سمجھیئے اور قرآن کریم کی شمع فروزاں کو مضبوطی سے تھام لیجئے ۔۔۔ اس یقین محکم کے ساتھ کہ یہی وہ نور ہے یہی وہ ضابطۂ حیات ہے جس کی روشنی میں، جس سے ہم آہنگی سے ہم نے پہلے بھی اقوامِ عالم میں سربلندیاں حاصل

کی تھیں ، اور اب بھی ہمارے ہر دکھ ، ہر درد کا مداوا اسی ضابطۂ حیات پر عمل میں ہے ۔ فرمانِ خداوندی ہے کہ اِسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۔۔ یاد رکھیئے ۔ اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ کردار کے بغیر اگر ہمیں کچھ دنیاوی ترقیاں و کامرانیاں ، اور علوم فطرت کی بنا پر تسخیر کائنات سے حاصل ہو جائیں تو وہ ناپائیدار ہوں گی ، وہ ایسی سحر ہوگی جو بہت جلد تاریکیوں میں ڈوب جائے گی ۔ لیکن ہم آپ جس سحر کی نمود دیکھ رہے ہیں جس سحر کی حسین آرزو ہمارے دلوں میں ہے ، وہ جبھی ممکن ہے کہ آپ ہم سب ملکر شمع قرآنی کو مضبوط تھام لیں ، اور ہر قدم اسی کی روشنی میں اٹھائیں ۔

لیجئے ! اب ہم سنیں کہ ہماری بیٹیوں اور سلیم بیٹوں کو کیا کیا نظر آرہا ہے ۔ یقیناً اُن کی فکر و نظر کی بلندی ہم سے تیز ہے اور یہی ہماری آپ کی امیدوں کا سہارا ہے ۔ شکریہ !

---

(۱)

پروفیسر خالد اکرام

آثار بتاتے ہیں سحر ہو کے رہیگی

صدر محترم ۔ خواتین و حضرات !

اپنے مقصد کے حصول کے لئے ہمارے سامنے گوناگوں رکاوٹیں آتی ہیں ۔ یہ رکاوٹیں انتہائی پریشانی پیدا کرنے کا موجب بن جاتی ہیں ۔ باہر سے آنے والی رکاوٹوں کا تو شاید کچھ نہ کچھ سدِ باب فکر انسانی کر ہی لیتی ہے لیکن اپنے اندر سے پیدا ہونے والی کشمکش تو اسے پوکڑی بھلا دیتی ہے ۔ راستہ کی سختی ، مسافت کی درازی اور شدتِ کشمکش ایسی گھبراہٹ پیدا کر دیتی ہے کہ انسان سوچتا ہے " سفر چھوڑو ۔ کہیں کسی پُرسکون گوشہ میں اطمینان کی نیند سو جاؤ " لیکن ۔۔ اطمینان سے سو جانے سے تو ظلمات میں سحر کبھی نہ ہو سکے گی ۔ آنکھیں بند کر لینے سے شاید اندھیرے اور روشنی کا امتیاز تو مٹ جائے لیکن فریب انگیزی سے جو سامانِ راحت مل بھی جاتے وہ زیادہ دیر تک وجہ سکون و اطمینان نہیں رہتا ۔ اس کا حل تو یہی ہے کہ ؎

چارہ این است کہ از عشق کشادے طلبیم
پیشِ اُو سجدہ گزاریم و مرادے طلبیم

یہ کیسے اطمینان ہو کہ ہمارے پاس جو قرآنی چراغِ رہنمائی ہے اور جس کی روشنی میں ہم بوساطت "طلوعِ اسلام" آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ فی الواقعہ انسانیت کو عافیت کی راہوں سے صحیح و سالم منزلِ مقصود کیطرف لے جائے گا؟

سوال بڑا اہم ہے لیکن اس کا جواب بڑا صاف ہے۔ ہمارے سامنے فکرِ انسانی کی تاریخ موجود ہے۔ ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ وہ کون کونسی راہیں ہیں جو انسانیت کو تباہی کی طرف لے گئیں۔ اور اگر یہ بھی دیکھیں کہ خون کی ندیاں پینے اور آگ کی خندقیں پھاندنے کے بعد بچے کھچے کاروانِ انسانیت نے جس طرف کا رُخ کیا وہ کس سمت کو ہے؟ کیا یہ وہی سمت نہیں جس کی نشاندہی قرآن نے اپنے انقلاب آفریں اعلان میں بہت پہلے ہی کر دی تھی۔ اور ان دوسری راہوں کے متعلق کہہ دیا تھا کہ یہ بربادیوں کی راہیں ہیں ــــ تو یہ شہادت اس امر کی دلیل ہو سکتی ہے کہ آئندہ کے متعلق جو قرآن کہتا ہے کہ سحر ہو کے رہے گی اس کی صداقت اور صحت پر یقین رکھا جائے۔

ایک مشکل یہ ہے کہ اس وقت بھی دنیا میں جب ہم باطل کی قوتوں کے جمگھٹے کو دیکھتے ہیں تو گھبرا کر آنکھیں میچ لیتے ہیں۔ ہر قوم نے جنگل کے قانون کو اپنایا ہوا ہے اور اس کے مطابق ہر ایک قوم دوسری قوموں کو ہڑپ کرنے کی فکر میں غلطاں و پیچاں ہے۔ لیکن یہ دیکھئے کہ قرآن سے پہلے ان تصورات کے علاوہ کتنے ہی اور انسانیت سوز تصورات کا دور دورہ تھا جو ایک ایک کر کے فضا سے چھٹتے چلے جا رہے ہیں۔ اور انسانیت جن بوجھوں تلے دبی ہوئی کراہ رہی تھی، ان میں سے زیادہ اتر چکے ہیں اور یہ بھی کہ انسان من حیث المجموع ایک ایسی شاہراہ کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہا ہے جو اسے (قرآن کی بتائی ہوئی) منزلِ انسانیت کی طرف لیتی آ رہی ہے۔

اگر انسان کہیں از خود وحی کی بتائی ہوئی رہنمائی کے مطابق چلنے لگے تو برسوں کے کام دنوں میں ہو جاتے ہیں۔ لیکن چونکہ انسانیت نے یہ راستہ اختیار نہیں کیا اس لئے خدا کا "کائناتی قانون" یا جسے "زمانے کے تقاضے" کہا جاتا ہے وہ انسانیت کو اس سمت میں اپنی ہی رفتار سے دھکیلے چلا آ رہا ہے۔ لیکن اس کی رفتار بڑی سست ہوتی ہے۔ خدا کا ایک ایک دن ہمارے حساب و شمار سے ہزار ہزار برس اور پچاس پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے۔ لیکن ایسے لگتا ہے کہ زمانہ بعد از قرآن میں کائناتی قانون بھی کچھ تیز رفتار سا ہو گیا ہے۔ اور انسانیت سوز تصورات کو جھٹلانے میں اس کو اب پچاس پچاس ہزار سال نہیں لگ رہے۔ بلکہ ان ہزار سال میں ہی انسانیت کتنے ہی قدم صحیح سمت کی طرف بڑھ آئی ہے۔

آیئے! اب ہم چند ایک تصورات کو لیتے ہیں جنہیں انسانی فکر نے ہزاروں سال اپنائے رکھا اور

قرآن کے نزول کے بعد ہی آہستہ آہستہ وہ ان سے چھٹکارا پا سکی۔

۱۔ ملوکیت

انسان کی ابتدائی طرزِ زندگی میں ہی مستبد حکمرانوں نے دیکھا کہ انسانوں کو صرف ڈنڈے کے زور پر دبائے رکھنا اور اپنا اقتدار قائم رکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ لیکن ایک طبقہ ایسا تھا جو عوام کی عقیدتمندیوں کی وجہ سے بڑا اونچا مقام حاصل کر لیتا ہے اور وہ ہے مذہبی پیشواؤں کا طبقہ۔ تو ان شہنشاہوں نے اُن سے سازباز کی کہ۔

من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو

اور ان کے ذریعہ اپنے لئے (DIVINE RIGHTS) کا عقیدہ وضع کروایا اور خود کو ان کی زبانی "ظل اللہ علی الارض" کہلوایا۔ اور اس طرح اپنی مفاد پرستیاں حاصل کرنے میں انہیں بڑی آسانی ہو گئی۔ اور ان کے حصول میں خدا کا نام لے لیکر جو مظالم انسانیت پر ڈھائے گئے ان کا عشر عشیر بھی شیطان کے حصے میں نہیں آیا۔

اُس زمانے میں یہ پکار کہ "کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ خدا اسے ضابطۂ قوانین۔۔ فیصلہ کرنے کی قوت اور نبوت (تک) بھی عطا کر دے اور وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا سے ورے ہی میرے محکوم بن جاؤ" ...... اور یہ کہ "انسانوں کو اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کرنے چاہئیں" ــــ بڑی ہی نامانوس تھی۔ چونکہ انقلابی آواز اپنے زمانے سے آگے ہوتی ہے اس لئے انسانی اذہان اس کو فوری طور پر قبول کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ آہستہ آہستہ ہی ذہنِ انسانی اس کو قبول کر سکا۔ تا آنکہ فرانس کے گلی کوچوں میں وہ انقلاب برپا ہوا جس نے ملوکیت کو مٹا کر جمہوری نظام کی طرح ڈالی۔

ملوکیت کے پرخچے اُڑتے ہی مذہبی اجارہ داری اور پیشوائیت کے جسدِ مردہ کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول ہوئی اور انہیں پتہ لگا کہ جسے وہ زندہ سمجھ کر بڑے فخر سے اپنے کاندھوں پر اٹھائے پھر رہے تھے وہ تو مردہ ہے ــــ یاد رکھئے! اسے "مذہب" تو دراصل ہے ہی دین کی ممی شدہ لاش کا نام۔ کچھ قومیں اس لاش پر ابھی رونے دھونے میں لگی ہوئی ہیں اور کچھ اسے کفنانے دفنانے کا بندوبست کر چکی ہیں۔

۲۔ پیشوائیت

قرآن سے پہلے دنیا کی یہ حالت تھی کہ بڑے بڑے مفکرین سے لے کر عام انسانوں تک، مندروں، قربان گاہوں، معبدوں اور خانقاہوں کی پُراسرار مجوبہ پرستیوں کے شکار تھے اور راہبوں، پجاریوں، منتریوں اور

کاہنوں کے دامِ تزویر میں گرفتار۔ اسی زمانے میں قرآن نے کہا کہ انسان اور خدا کے درمیان کوئی تیسری قوت طاقت حائل نہیں۔ یہ تمہاری کمائی پر عیش کرنے والا مترفین کا طبقہ ہے جو ہمارے اور تمہارے درمیان حائل ہوجاتا ہے۔ سورۃ توبہ میں ہے۔

"اے وہ جماعت جو خدا کے قانونِ ربوبیت کو اپنی زندگی کا نصب العین بناتے ہو، اس حقیقت کو سامنے رکھو کہ اربابِ طریقت و شریعت کا اکثر گروہ ایسا ہے جو لوگوں کی کمائی کھاتا ہے اور ہمیشہ تخریبی نتائج کا موجب بنتا ہے۔ اور اس طرح معاشرہ کو مثبت نتائج پیدا کر کے آگے بڑھنے سے روکتا ہے" (۹/۳۴)

روس میں مارکس نے اپنی جو انقلابی تحریک ملوکیت کے خلاف چلائی اور جس میں اسے خدا کے تصور کو 'افیون' قرار دینا پڑا، وہ دراصل اربابِ طریقت و شریعت کا تراشیدہ خدا ہے۔ جس خدا کے نام پر پیشوائیت اپنی مفاد پرستیوں کو الوہیاتی سند بہم پہنچاتی ہے تاکہ محنت کش طبقہ ان کے چنگل سے نکلنے نہ پائے اور ان کی کمائی کو یہ مفت میں اڑائیں۔

کمیونزم دراصل عیسائیت یا مذہب کے خلاف ردِّ عمل ہے۔ اور سرمایہ داری کے ساتھ ٹکراؤ اس لئے ہوتا ہے کہ وہ بھی 'مذہب' کے بل بوتے پر ہی اپنی ساکھ قائم رکھتی ہے بقول علامہ اقبالؒ ؎

وحی یہ دہریت روس پر ہوئی نازل
کہ توڑ ڈال کلیسائیوں کے لات و منات

یہ تحریک دنیا کو قرآن کے پیغام کی اس سٹیج تک لے آئی ہے جہاں وہ باطل کی (NEGATION) کرتا ہے۔ یعنی "لا الٰہ" کی سٹیج ۔ لیکن چونکہ ایک مثبت نظریۂ حیات پیش کرنا انسانی عقل کے بس کی بات نہیں اس لئے یہ تحریک "لا" تک ہی آسکی ہے، اس میں "الا اللہ" کا اضافہ کرنا باقی ہے۔ یعنی قرآن کے بتائے ہوئے مثبت پروگرامِ حیات کا۔ بقول علامہ اقبالؒ ؎

در مقامِ "لا" نیاساید حیات
سوئے "الّا" می خرامد کائنات
لا و الّا سازو برگِ اُمتاں
نفی بے اثبات مرگِ اُمتاں

۳۔ سرمایہ داری، زمینداری، جاگیرداری

قرآن نے زمین کے متعلق کہا۔ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیۡنَ ۔ (۴۱/۱۰) اسے تمام ضرورت مندوں کے لئے

یکساں طور پر کھلا رہنے کے لئے بنایا گیا ہے۔ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ۔ (۵۶/۷۳) — بھوکوں کے لئے رزق کا سامان حاصل کرنے کے لئے۔ اور یہ سب رِزْقًا لِّلْعِبَادِ۔ (۵۰/۱۱) — خدا کے بندوں کے لئے سامانِ زیست ہے۔

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و نظر کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں!

لیکن انسان ضرورت سے فاضل چیزوں کو روکتا چلا جاتا ہے اور اس کے بدلے سونے کی اینٹیں ذخیرہ کر لیتا ہے یہی بنیاد ہے نظامِ سرمایہ داری کی۔

قرآن نے کہا تھا جو خدا کی راہ میں سامانِ زیست کو کھلا نہیں رکھتے ان کے لئے تباہی ہے۔ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ جن قوموں نے اپنے ہاں نظامِ سرمایہ داری کو رائج کیا وہ تباہ و برباد ہو گئیں۔

سلطنتِ روما کے زوال کے متعلق رابرٹ برفا (BRIFFAULT) اپنی کتاب (THE MAKING OF HUMANITY) میں لکھتا ہے۔

"روما کی سلطنت عام انسانوں کی لوٹ کھسوٹ سے ایک خاص جماعت کو متمول بنانے کا ذریعہ تھی۔ انہوں نے سوداگری کو نہایت خلوص، قابلیت، تدبر اور دیانت داری سے چلایا۔ لیکن حسنِ انتظام کی یہ تمام خوبیاں بنیادی باطل کو اس کے فطری نتائج سے نہ بچا سکیں۔"

تاریخ میں ہمیشہ ایسا ہوا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

تدبّر کی فسوں سازی سے قائم رہ نہیں سکتا!
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہو

۴۔ نیشنلزم

قرآن سے پہلے انسانوں کی تقسیم ملکوں کی چار دیواریوں اور قومی حد بندیوں کی رو سے ہوتی تھی اور وطن کی خاطر جان دینا سب سے مقدس ترین فرض سمجھا جاتا تھا۔ (MY COUNTRY, RIGHT OR WRONG) کے اس سیاسی عقیدہ کو اس صدی میں بڑا فروغ حاصل ہوا۔ مختلف اقوام میں باہمی لڑائیوں کا سبب اس کے سوا شاید ہی... کچھ ہوا ہو کہ یہ قومیں انسانوں کی مختلف جماعتیں تھیں جنہوں نے اپنے الگ الگ نام رکھ لئے تھے۔ نیشنلزم کی اسی لعنت کی وجہ سے ہی انسانیت کو دو عظیم جنگوں کا شکار ہونا پڑا۔

قرآن نے تیرہ صدیاں پہلے کہا تھا کہ انسانیت کے حصے بخرے نہیں کئے جا سکتے — "كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً۔ (۲/۲۱۳)۔ انسانیت کی اصل ایک ہے۔ " انسانوں کی تقسیم اور قوموں کی تشکیل

وطن، رنگ، نسل اور زبان کے اشتراک سے نہیں ہو سکتی۔ یہ تو صرف اس لئے ہے تاکہ تم ایک دوسرے سے متعارف ہو سکو۔ (۴۹/۱۳)"

وہ کہتا ہے کہ دنیا میں ثبات و دوام صرف اس نظام کو حاصل ہو سکتا ہے جو کسی ایک پارٹی، خاص گروہ، ایک نسل، ایک قوم کے لئے نہیں بلکہ تمام نوعِ انسانی کے لئے یکساں منفعت بخش ہو۔ (۱۳/۱۷)"

اس عملی تجربہ کے بعد مفکرینِ مغرب کس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

(۱)۔ (BERTRAND RUSSELL) لکھتا ہے۔ "نیشنلزم نوعِ انسانی کی تباہی کے لئے سب سے بڑی قوت ہے۔"

(۲)۔ (EMREY REVES) نے (THE ANATOMY OF PEACE) میں لکھا ہے۔ "نیشنلزم کے نظریہ نے انسانی معاشرہ میں ایک فساد برپا کر دیا ہے۔ لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ خود نیشنلزم خواہ وہ انٹرنیشنلزم ہی کیوں نہ بن جائے ۔۔۔ اس کا حل دریافت کر دے۔ اس کا حل انسانی عالمگیریت (UNIVERSALISM) میں ہے۔"

ان مختصر سی گزارشات کو سامنے رکھتے ہوئے اقبالؒ کی ہمنوائی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ۔

"حقیقت یہ ہے کہ اقوامِ عالم کا باطنی اضطراب ۔۔۔ جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہم محض اس لئے نہیں لگا سکتے، کہ ہم خود اس اضطراب سے متاثر ہیں ۔۔۔ ایک بہت بڑے روحانی اور تمدنی انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔"

مغربی مفکرین کا امام وائٹ ہیڈ لکھتا ہے: "نوعِ انسان اب اپنا زاویۂ نگاہ بدلنے کی فکر میں ہے۔ اب کہنہ روایات کا اقتدار ختم ہو رہا ہے اب ہمارا یہ فریضہ ہے ۔۔۔ ہم مفکرین ۔۔۔ جویانِ علم و عمل انسانوں کا فریضہ ۔۔۔ کہ ہم ایک نئی دنیا کی تخلیق کریں اور اس دنیا کو ایک نئی نگاہ عطا کریں۔"

اس نئی دنیا کی تخلیق کس طرح ہوگی اس طرف پروفیسر آئن سٹائن نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

"ہم نے تلخ تجارب کے بعد سیکھا ہے کہ معاشرتی زندگی کی گتھیاں تنہا عقل کی مدد سے نہیں سلجھ سکتیں ۔۔۔ عقل ذرائع اور اسباب پر تو خوب نگاہ رکھتی ہے لیکن مقاصد اور اقدار کی طرف سے بالکل اندھی ہوتی ہے۔"

اقدار! ۔۔۔ کون سی اقدار؟

ہم سفرو! زندگی کی شبِ تاریک میں نورِ سحر اُن مستقل اقدار کے خورشیدِ جہانتاب سے ہی آئینہ پاش

ہونگا جو وحی کے ذریعہ ملتی ہیں اور جو آج قرآن کے دفتین میں محفوظ ہیں۔ ؎

مجھ کو تو یہ دنیا نظر آتی ہے دگرگوں
معلوم نہیں دیکھتی ہے تیری نظر کیا!
ہر سینے میں اِک صبح قیامت ہے نمودار
افکار جوانوں کے ہوتے زیر و زبر کیا

برادران عزیز! آئیے ہم مل کر یہ روح پرور نغمہ چھیڑیں کہ
آثار بتاتے ہیں سحر ہو کے رہے گی!

---

(۲)

اختر عباس سعید - بی - اے - بی - ایڈ

آثار بتاتے ہیں سحر ہو کے رہے گی

صدر گرامی قدر و سامعین کرام!

تمام اقصائے عالم میں آجکل سنتِ ہابیل و قابیل پر اس شدت سے عمل ہو رہا ہے کہ پوری انسانیت جہنم کی زندگی میں جل رہی ہے۔ میدانِ زندگی کے جس گوشے کو دیکھئے اس میں عقل خود بیں کی مفاد پرستی، قلب سیاہ کی خود غرضی اور انسان ساختہ نظامہائے ابلیسی کی فتنہ انگیزی کا جال بچھا ہوا دکھائی دے گا، اور تمام انسان دو نظاموں کی چکی میں بُری طرح پس رہے ہیں۔

ایک طرف اشتراکیت ہے اور دوسری طرف سرمایہ داری۔ پہلے نظام نے صرف لا الٰہ کا نعرہ لگا کر ایک طرف تو فرعونیت اور ہامانیت اور قارونیت کے گلے پر چھری چلا کر اسے ختم کر دیا ہے اور دوسری طرف اس نے روحانی اقدار کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر رکھا ہے۔ بہرحال یہ بات تسلیم کرنا پڑے گی کہ اشتراکیت نے مزدوروں، کسانوں اور عام انسانوں کے مفادِ کلی کو ترجیح دے کر بادشاہوں، مذہبی پیشواؤں اور سرمایہ داروں کے اتحاد ثلاثہ کے بتوں کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پاش پاش کر دیا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس نظام نے کاروانِ انسانیت کو روحانیت کے راستے سے بھی ہٹا دیا ہے۔ لا الٰہ کے بعد نعرہ الا اللہ کو بالکل نظر انداز کر دیا۔

یعنی اس نظام نے انسان کی حیوانی زندگی کے تقاضے تو پورے کر دیئے ہیں لیکن اس کی انسانی زندگی کو نظر انداز ہی نہیں کیا اس سے یکسر انکار کر دیا ہے۔

دوسری طرف نظامِ سرمایہ داری ہے جس نے زبان سے تو دونوں نعرے لگائے مگر عمل ایک پر بھی نہیں کیا بلکہ سرمایہ پرستی کے حامیوں نے یعنی فرعون، ہامان، اور قارون تینوں نے ملکر حقوق العباد کو اس طرح لوٹا کہ حق وانصاف، حلال وحرام اور انسانی ہمدردی کے تمام ضابطے بے کار ہو گئے۔ اور اس اتحاد ثلاثہ کا بوجھ بھکر طرسرمایہ دار، مزدوروں، کسانوں اور عام انسانوں کی محنت کا پھل بے دریغ اور بے حساب کھائے چلا جارہا ہے۔ اور دولت کی بدمستی کو نعمت خداوندی سمجھ کر علامہ اقبالؒ کے ان ارشادات کو سنتا تک نہیں کہ

کارخانے کا ہے مالک مردکِ ناکردہ کار
عیش کا پتلا بنا محنت اسے نہ سازگار
حکمِ حق ہے لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰی
کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

برادرانِ عزیز! جب ان سرمایہ پرستوں کے حامیوں کے ہاتھوں میں عنانِ حکومت آجاتی ہے تو پھر وہ کیا کرتے ہیں؟ آیئے — ویٹ نام کے دلدلی میدانوں میں، مشرقِ وسطے کے گرم ریگ زاروں میں، اور افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں، جہاں انسانیت دم توڑ رہی، شرافت سر پیٹ رہی ہے اور غیرت دو ہاتھوں کا ماتم کر رہی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے سب سے بڑے پجاری، امریکہ کے طیارے ویٹ نام کے معصوم باشندوں پر بم برسا کر اشتراکی نظام کی شکست کا اعلان کرتے ہیں اور بیت المقدس کی عبادتگاہوں کو مسمار کر کے اسرائیل جشنِ فتح مناتے ہیں۔ اُردن کے بے گناہ شہریوں سے پوچھیے، ان کو کس جرمِ ضعیفی کی پاداش میں بنیپام بموں سے نوازا گیا ہے۔ عرب کے ان یتیم و بےسہارا معصوم بچوں کو دیکھیے کہ وہ آج بھی اپنے مرحوم ماں باپ کو تلاش کر رہے ہیں۔ مشرقِ وسطے اور ویٹ نام کی ان بیوہ عورتوں کی حالتِ زار کا نوحہ پڑھیئے جو اپنے سہاگ کو راکھ کے ڈھیروں میں تلاش کر رہی ہیں۔

عزیزانِ کرام! یہ ہے وہ دو نظاموں کی کشمکش جس میں انسان پس رہے ہیں۔ اور اخلاق و مروت کے تمام اصول ٹوٹ رہے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی ایک دوسری آواز بھی سنائی دیتی ہے اور وہ یہ کہ روس کے کوسیجن ہوں یا امریکہ کے جانسن، فرانس کے ڈیگال ہوں یا چین کے ماؤزے تنگ — سب اس پر متفق ہیں کہ دنیا سے بلا کسی امتیاز رنگ ونسل بھوک، بیماری، اور غربت و افلاس کا خاتمہ کر دیا جائے۔ مگر صرف مادی ترقی کی ہوس ان کو انسان کی ذات کی نشوونما کی طرف نہیں آنے دیتی۔ ان کے لئے جذبۂ محرک صرف مادی اقدار ہیں۔ اس لئے اُن

کے ذہن جہاں یہ سوچ رہے ہیں، کہ چین پر پانچسو (۵۰۰) ایٹم بم گرا کر اسے تباہ و برباد کر کے اپنا مطیع و غلام بنا لیا جائے وہاں انہیں واشنگٹن اور نیویارک کے کھنڈرات بن جانے کے خواب بھی دکھائی دے رہے ہیں۔ روس جہاں فضائی بموں سے اپنے دشمنوں کو مٹانے کی سوچ رہا ہے وہاں اسے اپنے زمین پر فنا ہونے کا خطرہ بھی لاحق ہے۔

برادرانِ عزیز! لیکن اِس طوفانِ ہلاکت کے ساتھ ہی دنیا کے کچھ گوشوں سے یہ صدائیں بھی سنائی دے رہی ہیں کہ ۔ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ ۔ (اس زمین پر فساد برپا مت کرو) اور اس دنیا کے کروڑوں انسان باطناً اور ظاہراً جنگ و جدال اور فتنہ و فساد کے خلاف نہ صرف مظاہرے کر رہے ہیں بلکہ خودکشی کر کے اپنی جانیں تک ختم کر رہے ہیں۔ لیکن قیامتِ موجود کا اسرافیل، امریکہ انسانی تباہی کا صور برابر پھونکے چلا جا رہا ہے۔ اس کی تدبیر پر تقدیر کچھ اس طرح خندہ زن ہے کہ اسرائیل اور ویٹ نام کی جنگوں میں وہ سیاسی طور پر بالکل ننگا ہو چکا ہے اور دنیا کی اکثر اقوام اُس کے حق میں چند کلمات جواز تک کہنے کو تیار نہیں اور دنیا کے عوام یہ بات اچھی طرح سمجھ چکے ہیں کہ اسرائیل، امریکہ اور استعماریت پسند ملکوں کا کھلا ہوا زہر آلود خنجر ہے اور بھارت ان کا دستِ پوشیدہ ہے۔ اسی لئے ایشیا کے بعض ممالک بھارت کے منہ کی رام رام سے زیادہ متاثر ہیں اور انہیں اس کی بغل کی میٹھی چھری دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ لیکن جس طرح امریکہ بے نقاب ہو چکا ہے، اسی طرح اس کے حلقہ بگوش بھارت کی پردہ دری بھی ہو کے رہے گی۔ امریکہ، بھارت اور دیگر استعماری قوتیں مل کر بھی اُس روزِ حساب کو نہیں ٹال سکتیں جو آتا ہوا دکھائی دے رہا ہے اور آ کے رہیگا۔

بزرگانِ گرامی! عربوں کی حالیہ شکست نے انہیں "لَا تَفْرَحْ قَوْمًا" کا عبرتناک سبق سکھا دیا ہے اور اب وہ اتحاد و اتفاق کی منزل کی طرف بڑھتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ افریقی ممالک ایک مشترک وفاق بنا کر استعماری اور جنگجو اقوام کے خلاف صف آرا ہونے کی سوچ رہے ہیں۔ ایشیا کے رہبر اعظم چین کے رہنما کا یہ کہنا۔ "کسی ملک پر پہلے حملہ نہ کرو، کھیتوں کو پائمال مت کرو، عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو، قیدیوں کو تنگ مت کرو، انسانوں کے ساتھ نرمی سے بات کرو اور دنیا سے افلاس کا نام و نشان تک مٹا دو۔

برادرانِ عزیز! یہی وہ آثار ہیں جو سحر کی نشان دہی کر رہے ہیں۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ باتیں نئی ہیں اور دنیا نے پہلی مرتبہ سنی ہیں۔ نہیں۔ یہ تمام باتیں صحرائے عرب میں پیدا ہونے والے اس عظیم ترین انسان کی بتائی ہوئی ہیں جس نے تیرہ سو سال پہلے تاریک دور کو سنہری دور میں تبدیل کر کے وحی کی روشنی میں ایسے قرآنی معاشرہ کی بنیاد رکھی جس کا ہر فرد خوب سمجھتا تھا کہ ؎

یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں!

مگر آج انسان تنہا اپنے مشاہدات اور تجارب کی بنا پر آہستہ آہستہ اُسی نظامِ خداوندی کی طرف آ رہا ہے جو عالمگیر انسانیت کی ربوبیت کا ضامن ہے لیکن یہ بڑی جانکاہ مشقتوں اور استخواں شکن ٹھوکروں کے بعد جنت گم گشتہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کے برعکس انسان اگر وحی کی راہ نمائی میں اُس منزل کی طرف بڑھے تو قلیل مُدت میں دونوں جہان کی سرفرازیاں اور کامرانیاں اس کے قدم چومنے لگیں ـــ اور بقول علامہ اقبالؒ ۔ ؎

عشق کی اِک جست نے طے کر دیئے قصّے تمام
اِس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

برادرانِ عزیز! پاکستان، ترکی اور ایران کا یہ اتحادِ ثلاثہ اس امکان کی نشاندہی کر رہا ہے کہ ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لیکر تا بخاکِ کاشغر!

ـــ اور یہ آثار اُس نورانی سحر کی طرف صاف اشارہ کر رہے ہیں جس کے متعلق شاعرِ مشرق نے پیشگوئی کی ہے کہ ؎

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونیوالا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی!

یہ ذہنِ ہندی، اب ذہنِ پاک میں تبدیل ہو رہا ہے اور یہ نطقِ اعرابی اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آج عرب ممالک پاکستان کو اپنی عرب برادری میں شامل کرنے پر فخر محسوس کر رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ پاکستان کے دس کروڑ عوام ہم عربوں سے زیادہ عربی زبان کی تلاوت کرتے ہیں اور قرآن کو اپنے سینوں سے لگائے پھرتے ہیں ـــ کاش! ہم اس کتابِ زندہ کو سمجھیں بھی ـــ اور اب ہمیں اس کو سمجھنا ہوگا۔ یہی وقت کا تقاضا ہے کہ ہم دانائے راز علامہ اقبالؒ کے اوپر بیان کئے ہوئے شعر کی ایک جیتی جاگتی تصویرِ عمل بن جائیں۔

عزیزانِ گرامی قدر! آثار بتاتے ہیں کہ دنیائے انسانیت کا آخری سہارا قرآنی نظامِ ربوبیت ہے جس کی نشیرِ حیات اب دن بدن اونچے سروں میں سنائی دے رہی ہے اور بھٹکا ہوا کاروانِ انسانیت پھر اس زندگی کی طرف آ رہا ہے جسے قرآنِ حکیم نے "آدم کی جنت" کہا ہے اور جس کی بنیادی خصوصیات یہ ہیں کہ۔

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ۝ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ۝

(یعنی اس جنت میں نہ کسی کو بھوک کا خوف ستاتا تھا نہ پیاس کا، نہ کسی کو لباس کی فکر دامنگیر تھی اور نہ مکان کی۔)

اس میں تمام خزائن الارض انسانوں کے رزق کے بنیادی ذرائع تھے اس کی زمین پر انسانی ہوس اور خودغرضی نے ہنوز لکیریں کھینچکر "تیری اور میری" کے جھگڑے پیدا نہیں کئے تھے، جسے بھوک لگتی وہ جہاں سے جی چاہتا کھا لیتا۔ اسی کو قرآن نے جنتی زندگی سے تعبیر کیا ہے۔

برادران عزیز! ادارہ طلوع اسلام اسی قرآنی پیغام اور نظام کو تیس بتیس سال سے اپنی بساط کیمطابق اندرون اور بیرون ملک برابر پیش کئے جا رہا ہے۔ اور یہ — صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے؛ اگر اس میں دیر ہے تو بس اتنی ہے کہ — ؎

اٹھا لے سب سے پہلے بڑھکے جو مینا اسی کا ہے

اور آج روس یا چین اور دیگر اشتراکی ممالک کی روشِ تازہ اور گرمیٔ گفتار سے یہ پتہ چل رہا ہے کہ وہ اپنے ذاتی تجارب و مشاہدات کے بعد لاشعوری طور پر قرآن کی سمت چلے آ رہے ہیں اور بہت ممکن ہے کل کو وہ اسلام کے سوشل سسٹم کے ساتھ اسلام کا فلسفۂ حیات بھی سمجھ جائیں، جیسا کہ شاعر مشرق نے فرمایا ہے۔ ؎

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم ۔۔۔ بے وجہ نہیں "چین" کی یہ گرمیٔ گفتار
انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر ۔۔۔ کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
اندیشہ ہوا شوخیٔ افکار پہ مجبور! ۔۔۔ فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار!
جو حرفِ "قُلِ العَفو" میں پوشیدہ ہے ابتک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار!

---

(۳)

(محترمہ ثریا عندلیب)

آثار بتاتے ہیں سحر ہو کے رہیگی

محترم صدر مذاکرہ — بہنو اور بھائیو!

اپنی اس خوش بختی پر یہ دل مسرور و شاداں کیوں نہ ہو کہ آپکے طلوع اسلام کی سالانہ کنونشن کے اس

مذاکرے کا عنوان ہے ۔ آثار بتاتے ہیں سحر ہو کے رہیگی ۔ کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ اس یقین و ایمان سے بھرپور عنوان کا انتخاب ہی بجائے خود اس صداقت کی دلیل ہے کہ اس خاک سے گلرنگ سحر کی نمود ضرور ہوگی۔ کیا ہمارے سامنے خالق کائنات، خدائے ذوالجلال کا یہ اٹل فرمان نہیں ہے کہ ـــــ

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۔ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَ يَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

یعنی یہ ایک حقیقت ہے کہ تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور ایک کتاب مبین آئی ہے۔ اس کے ذریعہ سے اللہ ایسے لوگوں کو جو اپنے آپ کو قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ رکھنا چاہیں سلامتی کی راہ بتاتا اور ان کو اپنے قانون کے مطابق ظلمت سے نکال کر نور کی طرف لاتا ہے اور انہیں صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت کرتا ہے ـــــ اور یہ صراط وہ ہے جس پر اس نشو و نما دینے والے کا اپنا قانونِ ربوبیت گامزن ہے اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ـــ اس محکم مشعلِ ہدایت، اس قائم و دائم سراجِ منیر اور اس ازلی و ابدی نورِ مبین ہونے کے باوجود کیا ہم اس کے مجاز ہیں کہ اپنی آنکھیں بند رکھ کر اندھیروں میں بھٹکتے رہیں، اور یوں سحر کا اُجالا کبھی ہمارے مقدر میں نہ ہو!

اگرچہ یہ درست ہے اور اس تلخ حقیقت سے انکار کی گنجائش نہیں کہ مذہبی پیشوائیت اور نظامِ ملوکیت کے ہاتھوں صدیوں تک ہم پر ایسا جمود و تعطل طاری رہا کہ ہم مسلمان نہیں راکھ کا ڈھیر تھے ۔ سوچنے سمجھنے کی قوتوں سے عاری، غور و فکر کی صلاحیتوں سے محروم ـــ زندہ و پائندہ خدائے واحد کی زندہ و زندگی بخش کتاب ہمارے ہاتھوں میں تھی ـــ ہم تعظیماً اس کو سر آنکھوں سے لگا سکتے تھے، اس کے پاکیزہ الفاظ کو دہرا سکتے تھے۔ اس کی تلاوت سے "ثواب" حاصل کر سکتے تھے ۔ لیکن اس کی تعلیم کو سمجھ سکتے تھے نہ اس پر عمل کر سکتے تھے۔ مذہبی پیشوائیت کے کلی اختیار و اقتدار نے وحی کی عطا کردہ مستقل اقدار پر جو دبیز پردے ڈال رکھے تھے، اُن کو اُٹھانے کا ہمیں یارا نہ تھا۔ مگر تابکے ـــــ حق کی قوت پر باطل کی قوت غالب نہیں رہ سکتی۔ راکھ کے اُس ڈھیر میں جو دبی چنگاریاں موجود تھیں ان کے سلگنے کی دیر تھی کہ روشنی کی کرنوں نے چاروں طرف پھیلنا شروع کیا، اور فضائے انسانیت پر مسلط تاریکی کے بادل چھٹنے لگے۔ خوبصورت و دلفریب غلافوں میں چھپا ڈھکا قرآن باہر نکل آیا۔ اس کے حقائق پوری آب و تاب کے ساتھ ہماری نظروں کے سامنے جگمگانے لگے۔ جب ہم نے قرآن کے الفاظ کو قرآن کی زبان میں سمجھنے کی ہدایت پائی، تو ہمارے اذہان و قلوب کے تمام بند دروازے کھل گئے۔ تب ہم نے جانا کہ قرآن کو سمجھنے کے تعلق سے ہماری حالت تو یہ تھی کہ خود ہی اندر سے کواڑ بند کر

رکھا تھا اور خود ہی بیٹے رو رہے تھے کہ باہر کیسے نکلیں، اندھیرے سے روشنی میں کیسے آئیں؟ لیکن جب ہم نے ہاتھ بڑھایا، کواڑ کھولے تو باہر نکلنے کا راستہ صاف تھا۔

سامعین کرام! تاریخ شاہد ہے کہ آسمان کی آنکھ نے ایک مرتبہ وہ دور دیکھا ہے جب زمین خدا کے قانونِ ربوبیت کے نور سے جگمگا اٹھی تھی۔ اور انسان نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ خوابِ زندگی کی تعبیر کیا ہے۔ اور کاروانِ انسانیت کی منزلِ مقصود کون سی ہے۔ اور یہ دور وہ تھا جب مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۔ کے ہاتھوں نظامِ خداوندی کا تختِ اجلال بچھایا گیا۔ اور انسان نے عملاً محسوس کیا کہ سحر کس کا نام ہے، اور حقیقی آزادی کسے کہتے ہیں؟ تو کیا یہ نورِ مبین اسی عہد ہمایوں کے لئے مختص تھا؟ پھر قرآن مبین کا یہ دعویٰ کہ وہ تمام نوعِ انسانی کی قیامت تک رہنمائی کرتا رہے گا، چہ معنی دارد؟ بات یہ نہیں ۔ اُس خدائے عظیم کی اس کتابِ حکیم کا یہ دعوے تو سراسر حق و صداقت پر مبنی ہے کہ ۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۔ مگر رہنمائی تو اسے ہی ملتی ہے جو خود رہنمائی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اور قرآن کا فرمان یہ ہے کہ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۔ جو لوگ ہمارے قانون کی تلاش میں جدوجہد کرتے ہیں ہم انہیں اپنے راستوں کی طرف راہنمائی دیتے ہیں۔ اور اسی لئے وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ۔ یعنی جس قوم کے افراد (مرد ہوں یا عورت) خدا کے ضابطہ کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیتے ہوئے ہمواریاں پیدا کرنے والے پروگرام پر عمل پیرا ہوں گے تو اسی قوم کے حصے میں جنت آئے گی۔ اور اس میں کسی قسم کی کمی نہیں کی جائے گی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ۔ اس سے بہتر نظامِ زندگی اور کس قوم کا ہوگا جو قانونِ خداوندی کے سامنے جھک جائے اور اس توازن بدوش پروگرام کو اپنا لائحہ عمل بنالے کہ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ یہ ہے محکم اور متوازن نظامِ ربوبیتِ خداوندی۔

اللہ کے وعدے تو بہرحال سچے ہیں اور اس کا قانون اٹل۔ ذرا انسانیت کے معراجِ کبریٰ یعنی دورِ رسالت کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے۔ وہ کون سا خاص پروگرام تھا جس نے مختصر سی مدت میں نہ صرف اس قوم کی تمدنی اخلاقی اور معاشرتی حالت ہی میں انقلاب پیدا کر دیا بلکہ ان کی معاشی اور اقتصادی زندگی کی بھی کایا پلٹ دی۔ اور کھجوروں کے ستو کھا کر گزارہ کرنے والی قوم قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کی وارث بن گئی۔ یہ وہی خداوندی کے مطابق سیدھے سادے اعمالِ صالحہ تھے جنہوں نے ان کے اندر وہ انقلاب پیدا کر دیا جو ایک مردِ مومن کی نگاہ میں تقدیریں بدل دینے والی قوت پیدا کر دیتا ہے۔ یہ اس لئے کہ یہ تمام اعمال درحقیقت مختلف اجزا تھے اس پروگرام کے جس کا عنوان قرآن کے پہلے چار الفاظ پر مشتمل ہے۔ یعنی اَلْحَمْدُ

لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ___ اللہ کا وہ پروگرام اور خدا کا وہ نظام جو نوعِ انسانی کی پرورش و تربیت کا ضامن بنتا ہے یوں خدا کے وعدے کے مطابق ایمان و اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض ہوتا ہے۔

دنیائے انسانیت اس درخشندہ سحر کی تابانیوں سے منور ہوئی۔ لیکن ___ اور یہ لیکن بڑا کربناک ہے کہ ___ اس کے بعد بہت جلد محض اپنے جذبات کے پیچھے چل کر مفادِ خویش کے اندھے کنوئیں میں گر گئی، اور صبح کا اُجالا ناپید ہو گیا۔ ربِّ جلیل کے پروگرام کے مطابق چل کر جس انسان نے آسمان کی بلندیوں تک پہنچنا تھا وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ۔ وہ اپنی خواہشات کے تابع ہو کر زمین کی پستیوں سے چپک گیا وَلٰكِنَّهٗ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ۔ پھر وہ اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا تھا کہ اب ہمارے نصیب میں سحر کہاں؟۔ لیکن قرآن کا پیغام تو یہ ہے کہ ؎

اگر یک قطرہ خون داری، اگر مشتِ پرے داری
بیا من با تو آموزم طریقِ شاہبازی را

اور اس کی نوید یہ ہے کہ اگر تم ایک قدم مشیتِ ایزدی کے مطابق اٹھاؤ گے تو تائیدِ ایزدی سو قدم آگے بڑھے گی اور اس کے ساتھ ہی اس نے ہمیں اس سعادت سے بھی نوازا ہے کہ ___ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ، تم بہترین قوم ہو جو نوعِ انسان کے فائدے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اس پر بھی ہمیں کفر و ضلالت کے اندھیروں تلے دبے رہنا کہاں تک زیب دیتا ہے؟ جس قرآن نے ایک مرتبہ وہ سحر دکھائی تھی اور یہ زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھی تھی وہی قرآن آج بھی ہمارے پاس موجود ہے، اور اس سے زیادہ ہماری خوش بختی اور آثارِ سحر اور کیا ہو سکتے ہیں کہ سینکڑوں تاریک ماہ و سال گزرنے کے بعد آج ہمارے اس دور میں خدا کی یہ کتاب نہ صرف اپنے الفاظ میں بلکہ اپنے اصلی اور صحیح مفہوم کے ساتھ نکھر اور ابھر کر ہمارے سامنے آگئی ہے۔ ہم پر خداوند کریم کی رحمتوں کا نزول اس صورت میں ہوا کہ ہمیں اس زمانے میں اور اپنی زندگی میں وہ مفکرِ قرآن عطا ہوا جس نے بہ توفیقِ ایزدی اپنی بصیرتِ قرآنی سے اس مکمل و غیر متبدل ضابطۂ حیات کے "اسرار و رموز" کو ایک ایک کر کے ہم پر اس طرح ظاہر و واشگاف کر دیا کہ ___ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ___ کی حقیقت محسوس شکل میں ہمیں نظر آنے لگی۔ اس نے خدا کے کلام کو سر آنکھوں پر رکھنے کی بجائے دل میں اتارنے کی راہ دکھائی۔ اس نے ہمارے سامنے وہ قرآنی تصورات بے نقاب کئے جن سے عہدِ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ میں وہ انقلاب پیدا ہوا جو دینِ اسلام کا نصب العین تھا، ہے، اور رہے گا۔ مگر یہ خارجی انقلاب

داخلی انقلاب کے بغیر رونما پذیر نہیں ہوتا۔ اور خالص قرآنی فکر کے بغیر قرآنی نظام کی تشکیل کا تصور بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اس کے لئے سب سے پہلے افرادِ ملت کے قلب و نگاہ میں قرآنی تعلیم کے مطابق تبدیلی کی ضرورت ہے جو قرآن ہی سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ ہم اپنی شوریدہ سری سے اس نعمت کو اپنے اوپر حرام کر چکے تھے۔ اس شبِ سیاہ میں ہمیں آثارِ سحر کیا نظر آتے؟ لیکن ہمیں تو آج کے دور میں یہ ساعتِ سعید ملی جس میں وہ رجلِ رشید آیا جس کے تفکر و تدبر نے ہماری تیرہ و تار دنیا روشن کر دی جس نے اپنے عزمِ راسخ اور سعیِ پیہم سے قرآنِ حکیم کے الحمد سے لے کر والناس تک پورے مطالب ہمارے سامنے کھول کر رکھ دیئے۔ ایک ایک لفظ کی بیسیوں بار قرآنی تشریح ہمارے قلوب میں جاگزین کر دی۔ ہر ہر درس میں قرآنی جامع اصطلاحات کا واضح اور متعین مفہوم ہمارے ..... ذہن نشین کرا دیا۔

یوں آیاتِ خداوندی کے بیش بہا موتیوں سے ہماری جھولیاں بھر دی گئیں۔ اس عظیم ذہنی انقلاب کے بعد کیا اب بھی ہم پر خارجی انقلاب لانے کی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی؟ ہمارا تو یہ زمانہ اس سحر کو قریب تر لانے اور اس انقلاب کو برپا کرنے کے لئے بڑا ہی سازگار اور موجودہ فضا اس کے لئے نہایت مساعد ہے کیونکہ وسائلِ رسل و مواصلات کی کثرت سے یہ دنیا اب سمٹ سمٹا کر ایک بستی اور اس کے رہنے والے ایک برادری بن چکے ہیں۔ اب کسی نظریہ کو ساری دنیا میں پھیلانا اور کسی تصور کو عام کرنا سامانِ نشر و اشاعت کی موجودگی کے ساتھ کچھ بھی مشکل نہیں۔ دنیا میں نظامِ ربوبیت تو قائم ہو کر رہنا ہے، یہ تو نویدِ قرآنی ہے اسے کوئی باطل روک نہیں سکتا ــــ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ ــــ کہ یہ نظامِ خداوندی تمام انسانی نظامہائے زندگی پر غالب آئے گا۔ زمانے کی آنکھیں تو ابھر ابھر کر یہ دیکھ رہی ہیں کہ وہ خوش بخت قوم کونسی ہے جس کے ہاتھوں قرآن کا یہ انقلاب ظہور میں آئے گا اور نظامِ انسانی کی رات کی جگہ نظامِ خداوندی کی صبح نمودار ہوگی۔ یہی وہ قوم ہوگی جس کے حصے میں تمام نوعِ انسانی کی امامت آئے گی اور جو عالمگیر انسانیت کو اس جنت کی طرف لے جائے گی جس کے لئے جنت سے نکالا ہوا آدم اس قدر مضطرب و پریشان ہے۔ اور جو انسانی آرزوؤں کی منتہیٰ اور کاروانِ انسانیت کی منزلِ حسنیٰ ہے ــــ طُوبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَآبٍ۔ پھر وہ سحر طلوع ہوگی جب گھروں کے اندر سکون و اطمینان کی بشارت گاہیں ہوں گی تو بازاروں میں اعتماد اور بھروسہ کی تسکین بخش پناہ گاہیں۔ جب کاروبار میں دیانت اور امانت کی قدروسی آفریں طمانیت نکھر کر سامنے آجائے گی۔ ہر فرد معاشرہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت کا سودا سر میں اور دیگر افرادِ انسانیہ کی بہبودی و خیر سگالی کا جذبہ دل میں لئے ہوگا جب انسان پکار اٹھے گا کہ ــــ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ رَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ــــ تمام حمد و ستائش اس اللہ کے لئے ہے جس کی ربوبیت

کاظہور کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہو رہا ہے اللہ جس کی ربوبیت کا نور تمام اقوام عالم میں جگمگا رہا ہے۔ اقبال کے الفاظ میں سے

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ جہاں معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

خواتین وحضرات! ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ دنیا میں فروغ آدمیت صرف اور صرف قرآنی چراغ سے ہو سکتا ہے۔ اور جو آفتاب قرآنی کی تابندہ شعاعوں کے ہوتے ہوئے سحر سے منکر ہوتا ہے وہ گویا اپنے وجود سے منکر ہوتا ہے، چنانچہ ہمارے لئے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ حق کے اس رواں دواں پروگرام میں منشائے خداوندی کے مطابق ہمارے دست وبازو بھی شامل ہو جائیں تاکہ صدیوں کی مسافت لمحات میں طے ہو سکے۔ اور ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہو جائیں کہ۔
اب سحر ہوا ہی چاہتی ہے ! واللہ المستعان! والسلام!

---

(۴)

محترم پرویز رحیم (لا کالج۔ لاہور)

آثار بتاتے ہیں سحر ہو کے رہے گی

صدر محترم! ۔ معزز حاضرین اور میرے قرآنی بھائیو اور بہنو!

آج اگر ہم بیسویں صدی کے اوائل میں لڑی گئی ہولناک جنگ عظیم کے بعد سے اقوام عالم کی تاریخ کا مشاہدہ کریں، تو یہ حقیقت ہمارے سامنے آئے گی کہ کس قدر شاہی حکومتوں کے تاج ہم نے اس قلیل عرصے میں اُڑتے دیکھے ہیں۔ ابتدا میں زار روس، جرمنی کے قیصر ولیم اور سلطنت عثمانیہ میں کمال پاشا کے لائے ہوئے انقلاب سے بادشاہت کا خاتمہ ہو کر جمہوری حکومتیں معرض وجود میں آئیں۔ لیکن مصر اور عراق میں فاروق اور شاہ فیصل کے عبرت ناک انجام تو کسی کی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ یورپ کے کئی ممالک میں بادشاہت ابھی تک قائم ہے لیکن بادشاہ کی قوت اس قدر محدود کر دی گئی ہے کہ اب وہ محض نام کے ہی بادشاہ ہیں۔ قانون سازی کے تمام فرائض پارلیمانوں کے ہاتھ میں ہیں۔

بادشاہت اور عامریت کے خلاف چودہ سو سال پہلے اسلام کی اٹھائی ہوئی آواز حقیقت بن کر

آج اقوامِ عالم کے سامنے آرہی ہے۔

اُس وحشیانہ دور میں جب کہ بیشتر عرب اپنے گھر پیدا ہونے والی ہر لڑکی کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے، اور یورپ میں بھی مردوں کی عورتوں پر برتری ایک مسلّمہ امر تھا، قرآن کی انقلابی آواز دونوں کے لئے مساوی رتبہ اور حقوق لے کر آئی۔

آج جب اقوامِ متحدہ اپنے ممبران ممالک سے اس بات کا اقرار لیتی ہے کہ وہ عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دیں اور ساتھ ہی عورتوں کو تنبیہ کی جاتی ہے کہ وہ دیکھیں آیا اس اصول پر اُن کے ملک میں عمل کیا جا رہا ہے تو قرآن کے سنہری حروف پھر ہمارے سامنے آتے ہیں۔

رنگ و نسل کا تضاد کہ جس نے گزشتہ کئی سالوں سے امریکہ میں خانہ جنگی کا سا ماحول پیدا کر رکھا ہے اور یورپی ممالک میں بھی سیاہ و سفید فام افراد میں اس کی تمیز مٹانے کی جو جدوجہد ہو رہی ہے تو یہ اسلام کی طرف ہی ایک قدم اٹھ رہا ہے۔ سربراہِ مملکتوں کے نزدیک اس مسئلے کا حل سب سے زیادہ اہمیت کا حامل بن چکا ہے۔

طلوعِ اسلام سے پہلے غلامی سے متعلق جو تصور عام تھا اس کے مطابق غلام کا بیٹا بھی غلام ہی سمجھا جاتا تھا۔ یعنی غلام پیدائشی غلام ہوتا۔ مگر قرآن نے آکر کہا کہ غلام پیدائشی غلام نہیں ہوتا۔ غلاموں کو آزاد کر دیا۔ بلکہ آزاد کر کے وہ رتبے غلاموں کو عطا کئے جس کی مثال کوئی پیش ہی نہیں کر سکا۔ موجودہ دور میں دنیا کے تقریباً تمام ممالک غلامی کو قانوناً ممنوع قرار دے چکے ہیں۔ امریکہ میں غلامی کے انسداد کے لئے جو لڑائیاں لڑی گئیں تو وہ بھی اسلام ہی کی زریں داستان کا ایک باب تھا۔ صرف عرب ممالک میں ہی غلامی کو بحال کر کے ابھی تک قائم رکھا گیا ہے۔

ہندوستان میں ذات پات کا مسئلہ صرف تمدنی ہی نہیں تھا بلکہ مذہب کا ایک لازمی جزو بھی تھا۔ ہر انسانی بچے کو دنیا میں پہلا سانس لینے سے پہلے ہی پیدائش کے اعتبار سے اُن بندھنوں میں جکڑ کے رکھ دیا جاتا کہ جن سے وہ عمر بھر کی سعی و کاوش کے باوجود بھی نہ نکل سکتا تھا۔ ایک بڑھئی یا لوہار کے ذہین بچے کے لئے ترقی کی تمام راہیں مسدود ہوتیں۔ اگر ایک حساس دل شودر کو اپنا نوعِ حیات حیوانوں سے بھی بدترین کیفیت میں بسر کرنے پر مجبور کیا جاتا تو برہمن کے لئے زندگی کی تمام لذتیں اور سہولتیں فراہم کی جاتی تھیں۔ یہ ہیں ذات پات کے وہ امتیازات کہ جن کا ہندو مت نے پرچار کیا اور حقارت، نفرت اور کراہیت کے جذبات کو مدنظر رکھتے ہوئے موجودہ ہندوستان کی بنیاد رکھی۔ اکاس بیل کی طرح چھائی ہوئی ذات پات کی یہ تمیز اب انفرادی حلقوں سے نکل کر پورے ہندوستان کو مجموعی

طور پر اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے۔ اور اب اسی طرح ہندوستان کی نشوونما کی راہیں مسدود کئے کھڑی ہے۔ ایسی سنگین صورت حال ہندوستان کے مفکرین اور سیاسی راہنماؤں کے لئے ایک بھیانک خواب سے کم نہیں۔

قرآن کریم کی پیش کردہ مستقل اقدار میں کہ جن کے گرد دین کی پوری عمارت گھومتی ہے، انسانی ذات اور احترام آدمیت کو بلند ترین مقام حاصل ہے۔ تمام فرزندانِ آدم کو واجب التکریم ٹھہرا کر قرآن نے اس حقیقت کی یاددہانی کرائی ہے کہ جس کے بغیر کوئی بھی نظام حیات تباہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آج ذات پات کی پابندیوں کو توڑ کر ہندوستان کے عوام کو جس اخوت اور بھائی چارگی کے جذبے کا سبق پڑھوایا جاتا ہے، اس کا مقصد ملک میں جمہوریت کو کامیاب بنانا ہے۔ جب اچھوتوں کو ہری جن (یعنی روح خداوندی کے حامل قرار دیئے جانا) جیسی تحریکیں اٹھیں تو کیا وہ اسلام کی ہی ابدی حقیقتوں کی نمود نہیں ہیں۔ اب تو سائنس کی تحقیق نے بھی ثابت کر دیا ہے کہ آب و ہوا کے علاوہ اور کوئی بھی عنصر کسی قوم اور نسل کی بناوٹ پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

جب اقوامِ عالم نے مل کر یہ فیصلہ کیا تھا کہ مختلف قوموں کے تنازعات کا فیصلہ باہمی مشاورت سے کیا جائے تو وہ بھی اسلام کی پیش کردہ تجویز پر عمل درآمد کی صورت تھی۔ اور اب خود ذہنِ انسانی میں یہ خیال انگڑائیاں لے رہا ہے کہ دنیا سے اسلحہ کا وجود ختم کر دیا جائے؛ تو یہ بھی اسلام ہی کے پروگرام کی ایک کڑی ہے جس نے چودہ سو سال پیشتر کہا تھا کہ جنگ کی اس وقت تک ضرورت ہے جب تک جنگ خود اپنے ہتھیار نہ رکھ دے۔

قومیت پرستی (NATIONALISM) کا تصور جس کا بیج مغرب میں بویا گیا، وہیں اس کا پودا پروان چڑھا اور اب انہیں فضاؤں میں مرجھا رہا ہے۔ اس عملی تجربہ کے بعد خود مغرب کے مفکرین جس نتیجہ پر پہنچے ہیں، اب راز نہیں رہا۔ اب وہ دنیا کے مصائب کا حل تلاش کرنے کی جستجو میں ایسی تجاویز پیش کرتے ہیں جن کا مقصد انسانیت کو قرآن کریم کے پیش کردہ نظامِ سیاست کے قریب تر لانا ہے۔ جب کوئی مغربی مفکر عالمگیر مملکت کی تشکیل کا نظریہ دنیا کے سامنے لاتا ہے تو قرآن کا وہ تصور کہ جس کے تحت وہ تمام انسانوں کو رفتہ رفتہ ایک قانون کے تابع (جہاں اقتدارِ اعلیٰ صرف ایک خدا کا ہو) لا کر وحدتِ انسانیت کی زندگی بسر کروانا چاہتا ہے، ہمارے سامنے آتا ہے۔ قرآن کے نزدیک تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ اور ایسا نظامِ سیاست متشکل ہو کر رہے گا۔ یہ انقلاب خونریزی سے نہیں بلکہ ذہنی طور پر رونما ہو گا۔

چنانچہ آج جب مغربی مفکرین اپنے نیشنلزم والے غلیظ تجربے پر کفِ افسوس ملتے نظر آتے ہیں اور نئے نظامِ سیاست متشکل کرنے کے جواز میں وہی دلائل پیش کرتے ہیں کہ جو قرآن بہت پہلے ہی انسانیت کو دے چکا ہے تو مغرب کی تنگ نظری اور ہماری اپنی نااہلی پر سخت رنج ہوتا ہے۔

اہلِ یورپ موجودہ ترقی سے پہلے جہالت اور ناشائستگی کی جن میت کھائیوں میں گر چکے تھے اُن سے باہر نکلنا ناممکن نظر آتا تھا۔ دنیا کی تاریخ میں وحشت اور بدحالی کی یہ انتہا تھی اور اسے اہلِ مشرق کی خوش قسمتی سمجھئے کہ وہ اس نوعیت کے بدترین دور سے کبھی بھی نہیں گزرے۔

صدیوں کی جدوجہد کے بعد آخر وہ سائنس کے مرہونِ منت ہو کر اپنی تہذیب کی پہلی سیڑھی اینٹ رکھنے میں کامیاب ہوئے اور کچھ ہی عرصے میں اُن تاریک خندقوں سے نکل کر اقوامِ عالم کے دیکھتے ہی دیکھتے فلک بوس دیواریں بلند کر چکے تھے۔

اہلِ یورپ کی یہ تیز رفتار ترقی باقی اقوام کو حیرت اور شش و پنج میں ڈال گئی۔ حتیٰ کہ ہمارا دور بھی تہذیبِ مغرب کا دور کہلایا۔ اس تہذیب کے تمدن اور شان و شوکت کی کیفیت یہ ہے کہ تعیشات اور آسائشاتِ زندگی کا کوئی شعبہ بھی ایسا نہیں کہ جس کو سائنس کی مدد سے اس نے مسخر نہ کیا ہو۔

لیکن غلط بنیادوں پر کھڑی یہ خوبرو عمارت خود اپنے معماروں کو احساس دلا رہی ہے کہ موجودہ تہذیب کی حقیقت اس وحشت ناک دور سے یکسر مختلف نہیں اور اسی احساس نے اہلِ مغرب کا فریبِ نفس والا اطمینان ختم کر دیا ہے۔ لوگوں میں صحیح ضابطۂ حیات حاصل کرنے کی فکر نمودار ہو چکی ہے یاد رہے کہ دین کی روشنی کے بغیر وہ اس سے بھی زیادہ تباہ کن نتائج پر پہنچ سکتے ہیں۔

یورپ کی یہ تہذیب تو اب رُو بہ زوال ہے لیکن امریکہ والوں کو اپنی غلط کاریوں کا احساس ابھی نہیں ہوا۔ چنانچہ اقوامِ عالم کی نگاہوں کا مرکز اب یورپ نہیں بلکہ امریکہ ہے۔

یورپ کی تہذیب سے نکلا ہوا یہ ملک جس کو اسی عمارت کے ہم پلہ تعمیر کیا گیا، سطوت و ثروت، اور دبدبہ و طنطنہ میں اپنے محسن سے بھی سبقت لے گیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ ذہنی نظام کے ہر شعبے میں حماقت، فریب اور ظلم کی منتقل نمائش میں بھی کوئی گنجائش باقی نہ رکھی۔ صلح اور امن کا پرچار کرنے والی یہ قوم گزشتہ اٹھارہ برس سے دنیا کی تاریخ میں سب سے بڑے قتل و غارت اور فساد کا موجب بنی ہوئی ہے۔ اور یہی وہ دور ہے کہ جب غلط بنیادوں پر استوار عمارت میں پہلی بار جنبش محسوس ہوئی ہے۔

اب ایک نظر اُس نظامِ حیات پر بھی ڈالئے کہ جو صدیوں سے رائج نظامِ سرمایہ داری کا ہمیشہ ہمیشہ کیلئے خاتمہ کرنے کی دُھن میں ہر وقت کامزن ہے۔

کارل مارکس کی ہمدردانہ اور پُرخلوص کوششوں کی بدولت ایک ایسا نظام تو وجود میں آگیا کہ جس میں دولت کی مساوی تقسیم کو سب سے بڑھ کر اہمیت دی گئی۔ لیکن بدقسمتی سے وہ عیسائیت کے فرسودہ نعروں کی تاب نہ لاکر مذہب کے تصور کو ہمیشہ کے لئے ترک کر بیٹھا۔ کاش! اس کے سامنے "مذہب" کی بجائے "دین" قرآن کریم ہوتا تو آج نصف دنیا ایک عظیم نظامِ حیات اور نظامِ سلطنت کو اپنا چکی ہوتی۔

موجودہ دور میں کمیونزم کا سب سے عظیم لیکن سادہ سیاسی اور ملٹری فاضل (GENIUS) ماؤزے تنگ کہ جس نے مارکس کے دستور کو دوبارہ لکھا ہے، تاریخ میں پہلی بار چین کے دہقان اور کاشتکاروں کے اژدہام کو ملکی معاملات میں کچھ حصہ دلوانے میں کامیاب ہوا۔ لیکن مذہب کے خلاف ماؤزے تنگ کی شدت مارکس سے بھی زیادہ بڑھ گئی۔

گزشتہ سال کے دوران ماؤزے تنگ اس احتمال پر کہ چین کی نئی نسل کمیونزم سے منحرف ہوتی جا رہی ہے، ملک بھر میں نوجوانوں پر مشتمل حفاظتی عسکر (RED GUARDS) کے ہاتھوں از سرِ نو انقلابی جدوجہد شروع کر بیٹھا جس کے نتائج نہایت سنگین نکلے۔ ہر طرف ہنگامہ، گھبراہٹ اور مایوسی پھیل گئی۔ اور قتل و غارت کے بازار گرم ہوئے۔

اس موقع پر ایک یورپی مدبر لکھتا ہے کہ "یہ کہنا کہ ماؤ پاگل ہو گیا، درست نہ ہوگا۔ بلکہ چین کی اس نازک گھڑی کے پیچھے تو کچھ اور ہی اجزاء کارفرما ہیں۔"

اور یہ ہیں وہ اجزاء کہ جن کی بنا پر کمیونزم کے کمزور فلسفہ حیات کی بنیادوں پر مضبوط معاشی نظام کھڑا ہونے سے قاصر ہے۔

معاشرے میں ہر فرد کی بنیادی ضروریات پوری کرنے والا کمیونزم کا معاشی نظام قرآن کریم کے تجویز کردہ معاشی نظام سے مماثلت رکھتا ہے۔ لیکن اس معاشی نظام کی عمارت صرف اس فلسفہ پر قائم ہو سکتی ہے اور برقرار رہ سکتی ہے جسے قرآن پیش کرتا ہے اور جس میں انسان کی ذات کے تقاضوں کو اس کے جسم کے تقاضوں پر ترجیح دی گئی ہے ــــ چین میں حالیہ واقعات عوام کی اس شدت کا اظہار ہیں کہ جو صحیح فلسفۂ حیات کو بروئے کار لانے کی ہر وقت کوشش میں سرزد ہوئے ہیں۔

اگر انسان اپنی زندگی میں وہ نظام متشکل کرے جو خدا کی دی ہوئی مستقل اقدار پر مبنی ہو، تو وہ اس سحر کی پہلی کرن ہوگی کہ جس کی سفیدی رات کی ظلمتوں کو چیرتی ہوئی آسمان پر نمودار ہو چکی ہے۔ جہاں جہاں تحریک نوعِ انسانی کو صحیح آزادی اور ترقی کی طرف لے جانے کے لئے اٹھی ہے، وہ قرآن ہی کی شمع نورانی کی ایک کرن تھی اور جہاں جہاں انسان اپنے خود ساختہ نظاموں سے تھک چکا ہے وہاں اس کا ہر قدم

بغیر شعوری طور پر اس نظام کی طرف آرہا ہے جو قرآن نے تجویز کیا تھا۔

(۵)

عزیز غزالہ شفان

آثار بتاتے ہیں سحر ہو کے رہیگی

(انگریزی مقالہ کا رواں ترجمہ)

یہ اسی لاہور کا واقعہ ہے اور چند ہی دن اُدھر کا۔ اس کہانی کے کردار ہیں — ایک غریب راہرو — ایک ٹرک کا مالک — اور ملک کی انتظامیہ کا ایک رکن جو قیام امن کا ذمہ دار ہے — ! ایک صبح وہ غریب مزدور، جو تین روپیہ یومیہ پر کہیں کام پر جاتا تھا، گھر سے نکلا۔ وہ سڑک پر جا رہا تھا کہ پیچھے سے ایک تیز رفتار ٹرک آیا اور اسے کچلتا ہوا آگے نکل گیا۔ وہ مزدور بری طرح زخمی ہوا۔ لوگوں نے اس کی مدد کی اور اسے ہسپتال پہنچا دیا۔ وہاں جس وقت ڈاکٹر اس کے شکستہ بازو پر پلاسٹر لگا رہا تھا اور اس کے زخموں کی مرہم پٹی کر رہا تھا، ٹرک کا مالک بھاگا بھاگا پولیس اسٹیشن پہنچ گیا۔ اس نے وہاں کے انچارج کے ہاتھ میں کچھ "سبز رنگ کے پتے" تھما دیئے۔ ان پتوں نے معجزہ کا کام کیا۔ اور معاملہ وہیں ٹھپ ہو کر رہ گیا۔

اب ایک اور کہانی سنیئے۔ ایک طالب علم نے میٹرک کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا اور ایک ایسے کالج میں داخلہ لینے میں کامیاب ہو گیا جس نے کئی ایسے طالب علموں کو داخل کرنے سے انکار کر دیا تھا جنہوں نے فرسٹ ڈویژن میں امتحان پاس کیا تھا۔ یہ اس لئے کہ سیکنڈ ڈویژن حاصل کرنے والے طالب علم کے والد ماجد صاحب اثر ورسوخ تھے۔

اور اسی طرح ایک اور کالج میں، اسی قسم کے ایک اور لڑکے کو داخلہ مل گیا۔ اس کا باپ صاحب اثر ورسوخ تو نہیں تھا، لیکن اس کی جیب میں روپیہ تھا۔ وہ مختلف کالجوں میں گھوما اور جہاں کم داموں پر سودا ہو گیا وہاں لڑکے کو داخل کرا دیا۔

میں اس قسم کی سینکڑوں دکھ بھری کہانیاں سنا سکتی ہوں — وہ کہانیاں جو بتائیں گی کہ ہماری عدالتوں کے احاطوں میں، درسگاہوں کے کمروں میں، ہماری مسجدوں اور ان کے حجروں میں، ہمارے کاروباری حلقوں میں — غرضیکہ ہمارے معاشرہ کے معاشرتی، سیاسی اور ثقافتی شعبوں میں کیا کچھ

ہو رہا ہے۔ اگر کہیں آپ کا اتفاق دیہات جانے کا ہو تو وہاں آپ کو ہر طرف بیماری، جہالت اور افلاس کے گھناؤنے بادل چھائے دکھائی دینگے۔ اور اگر آپ شہری زندگی کی طرف رُخ کریں گے تو وہاں آپ کو منافقت، آوارگی، بد دیانتی اور اقربا نوازی کا دور دورہ نظر آئے گا۔ یہی وہ بھیانک مناظر ہیں جن سے گھبرا کر ایک شاعر پکار اٹھتا ہے کہ؎

تن ڈھانپ پہن کر ٹاٹ، بھلے دن آئینگے
دم سادھ، زمانہ کاٹ، بھلے دن آئینگے
من جلے تو پھپھولے پھوڑ، زمانہ نازک ہے!
رکھ منہ کو لگا کر ڈاٹ، بھلے دن آئینگے
مر کر تو قبر الاٹ کوئی ہو جائے گی
مت ڈھونڈ ابھی گھر گھاٹ، بھلے دن آئینگے
آئی ہو جس دم نیند، زمیں کیا، سولی کیا
سونے کو ڈھونڈ نہ کھاٹ، بھلے دن آئینگے

آپ کہیں گے کہ یہ تصویر جو میں نے پیش کی ہے، بڑی یاس انگیز ہے اور میں آپ کو مایوسیوں کا پیغام دے رہی ہوں۔ لیکن تاریخ کی زنبیل میں ہمارے لئے اس سے یکسر مختلف تصویر ہے۔ اور وہ تصویر یہ ہے کہ کیا ہمارے ہاں کے حالات ویسے ہی نہیں، جنہوں نے ۱۷۸۹ء کے انقلاب فرانس، اور روس کے ۱۹۱۷ء کے انقلاب کو جنم دیا تھا؟ ان انقلابات نے یورپ کو امیدوں کے عہد نو سے آشنا کر دیا اور تباہی کے کنارے پہنچے ہوئے مغرب کی تاریکیوں میں حیات آور قندیل روشن کی؟ لیکن اس پردے کے پیچھے سے کیا نکلا؟ استعماریت، استبداد، غلامی، دو عالمگیر مہیب جنگیں، ہیروشیما اور ناگاساکی پر تباہی لانے والے ایٹم بم، جاپان، ویٹ نام ـــــ یہ تو ہوا انسان کی خارجی دنیا میں۔ اور اس کی داخلی دنیا میں جھانک کر دیکھو تو وہ اس سے بھی تاریک تر نظر آئے گا ـــــ امریکہ کی خواب آور L.S.D منشیات جن سے مدہوش ہو کر کوئی اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے کود کر جان دے دیتا ہے۔ وہ موٹر اور ٹرین کا راستہ روکے کھڑا ہے کہ اُسے اپنے سر سے ٹکرا کر پاش پاش کر دے گا۔ یہ ہمہ گیر جنون! یہ وحشیانہ پاگل پن!!

محترمہ صدر! سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کا پھر علاج کیا ہے؟ لیکن قبل اس کے کہ ہم اس کا جواب اپنے آپ سے نہ پاتے ہوئے پھر مایوسیوں کی دھند میں کھو جائیں، آئیے ہم تاریخ کے چند اوراق اور پیچھے کو الٹیں اور وقت کی گھڑی کو چودہ صدیاں پیچھے لے جائیں ـــــ وہاں ہمارے سامنے یورپ نہیں،

اشیا آئے گا۔ وہاں ہم کیا دیکھتے ہیں ـــ وہی ظلم و استبداد ـــ وہی سلب و نہب ـــ وہی غلامی کی لعنت ـــ وہی لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کی وحشیانہ لعنت ـــ انسان کا ایک سر اور سینکڑوں خودساختہ معبود جن کے حضور وہ جھک رہا ہے۔ ان کی حالت انسانوں کی سی نہیں بلکہ حیوانوں کی سی تھی۔ بَلْ هُمْ اَضَلّ !

لیکن دیکھو! انہیں تاریکیوں کے پیچھے، اُفق سے اُس پار سے روشنی کی ایک کرن نمودار ہوئی ـ ایک نشید حیات آور بلند ہوئی۔ اس نے دنیا کو ایک سادہ سا پیغام دیا ـــ معبود صرف ایک ہے اور میں اس کا پیامبر ہوں ـــ اور وہ پیغام یہ ہے کہ یومِ مکافات قریب ہے جب تمہارا فیصلہ تمہارے اقوال کے مطابق نہیں بلکہ افعال کے مطابق ہوگا۔ اس کے بعد اس نے دنیا کو ایک کتاب عظیم عطا کی جو اسے خدا کی طرف سے ملی تھی ـــ اس نے کہا کہ تم قوانینِ خداوندی کا اتباع کرو۔ اس سے تمہیں اس دنیا کی سرفرازیاں اور آخرت کی سربلندیاں عطا ہو جائیں گی۔ اس میں بڑے صاف اور سادہ امکانات دیئے گئے ہیں۔ اس میں مستقل اقدارِ حیات کا تعین کر دیا گیا ہے۔

اس نے یہ پیغام دیا اور عملاً ان اقدار کو معاشرہ میں متمکن کر کے دکھا دیا ـــ اور وہ دیکھو! وہی جاہل اور قابلِ نفرت معاشرہ طرفۃ العین میں کچھ کا کچھ ہو گیا۔ ان کے سامنے زندگی کا مقصد آ گیا۔ اس مقصد کے لئے ایک نظریہ مل گیا۔ اب افراد اپنی اپنی ذاتی مفاد پرستیوں کے پیچھے نہیں بھاگ رہے تھے۔ وہ عالمگیر انسانیت کے مفادِ کلی کے حصول کے لئے مصروفِ تگ و تاز تھے۔

یہ تیرہ سو سال پہلے کی بات تھی۔ لیکن اسی قسم کی ایک سہانی صبح کی نمود ہم نے دو سال قبل ستمبر ۶۵ء میں دیکھی تھی۔ اس صبح کی نمود کے بعد، ملک میں ہر طرف امن و سکون کا دور دورہ تھا۔ سارے ملک میں نہ چوری کی کوئی واردات ہوئی نہ قتل کی۔ بددیانتی اور اقربا نوازی کا تصور تک مٹ گیا۔ فضائیں ان نغموں سے معمور ہو گئیں جو اس سے پہلے کبھی نہیں سنے گئے تھے۔ ان سترہ دنوں میں نہ اشیاء کی قیمتیں اوپر چڑھیں، نہ بجلی ایک ثانیہ کے لئے فیل ہوئی۔ نہ ٹیلیفون کی گھنٹی غلط بجی، نہ ٹریفک کا کوئی حادثہ ہوا۔ اس وقت ہر شخص اپنا اپنا فرضِ منصبی سرانجام دے رہا تھا اور بڑی تندہی سے سرانجام دے رہا تھا ـــ اس وقت کوئی اپنے لئے کام نہیں کرتا تھا؛ سب دوسروں کے لئے کام کرتے تھے ـــ سب کے سامنے ایک نصب العین تھا، ایک مقصد تھا ـــ اور وہ نصب العین اور مقصد وہی تھا جسے قرآن نے متعین کیا تھا۔ اس وقت بے شک جذبہ حب الوطنی کی حرارت تیز تر تھی لیکن یہ حرارت خود قرآن کے شعلۂ طور کی پیدا کردہ تھی ـــ "دیئے جاؤ" ـــ ہر ایک کا مسلکِ حیات تھا۔ پاکستان میں صحیح قرآنی معاشرہ کی جھلک نظر آ رہی تھی۔

یہ محیر العقول تبدیلی کیسے واقع ہو گئی تھی؟ ۔ اس قندیل کو کس نے روشن کر دیا تھا؟ اس سوال کو اپنے سامنے دیکھ کر مجھے مولانا روم کی مثنوی کی ایک حکایت یاد آ گئی ۔۔ گاؤں کی لڑکیاں کنوئیں پر پانی بھر رہی تھیں۔ اور مجنوں دور ایک کونے میں خاموش بیٹھا تھا۔ انہوں نے مجنوں سے کہا کہ ہم تھک گئی ہیں۔ تم ذرا ہماری مدد کر دو۔ لیکن مجنوں میں ذرا جنبش پیدا نہ ہوئی۔ اس پر ایک شوخ و شنگ لڑکی کو کچھ سوجھا۔ اس نے مجنوں سے کہا کہ لیلے نے تمہارے لئے ایک پیغام بھیجا ہے۔ مجنوں اٹھ کر بیٹھ گیا اور پوچھا کہ وہ پیغام کیا ہے۔ اس نے کہا کہ لیلیٰ کا پیغام یہ ہے کہ تم اس کنوئیں کا پانی نکال کر برتن بھرتے جاؤ۔ مجنوں اٹھا کنوئیں پر پہنچا اور ڈول بھر بھر پانی نکالنا شروع کر دیا۔ ان کے برتن بھر گئے لیکن میاں مجنوں ہیں کہ بس کرنے کا نام نہیں لیتے۔ اس لڑکی نے مجنوں سے پھر کہا کہ اب ہمارے پاس لیلے کا ایک اور پیغام آیا ہے اور وہ یہ کہ مجنوں سے کہو کہ پانی نکالنا بند کر دے ۔۔ مجنوں پھر اسی کونے میں جا بیٹھا۔

بات صرف یہ ہے کہ ہماری لیلے کہاں ہے اور اس کا پیغام کہاں؟ لیکن ہمیں اس کے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیلیٰ خود ہمارے آغوش میں ہے ۔۔ اسی شانِ رعنائی و زیبائی کے ساتھ ہمارے آغوش میں ۔۔ اور اس کا پیغام بھی اپنی منزہ اور پاکیزہ شکل میں ۔۔ لیکن ہم نے اس پیغام کو تقدس کے غلافوں میں لپیٹ کر، نقش و نگارِ طاقِ نسیاں کر رکھا ہے۔ اس طاقِ نسیاں میں جو ہمارے سروں سے ذرا ہی اونچا ہے۔

مجنوں! ۔ اٹھو! لیلے کا تمہارے لئے ایک پیغام ہے۔ اور اس پیغام کو کون لایا ہے؟ ایک شریف اور سادہ سا انسان جس کے مکان کی چھت پر ہر شب ایک جگمگاتی "قندیل" زمانے کی تاریکیوں کو نورانیت میں تبدیل کر دیتی ہے ۔۔ وہ قندیل ہے طلوعِ اسلام ۔۔ اس کا پیغام یہ ہے کہ

قرآن کا اتباع کرو ۔۔ سحر طلوع ہو کر رہے گی!

---

(۶)

فریدالدین احمد۔

آثار بتاتے ہیں سحر ہو کے رہیگی

صدرِ محترم ۔ عزیز بھائیو اور بہنو!

مادی ترقی اور اخلاقی بے راہ روی نے آج دنیا کو تباہی کے کنارے لا کھڑا کیا ہے۔ کیفیت یہ ہے کہ

لیے سوجاتے ہوتے بندر کی انگلی کا سوئچ پر ہلکا سا دباؤ دنیا کی تباہی کا سبب بن سکتا ہے۔ مہلک ہتھیاروں سے لدے ہوئے خودکار طیارے ہر وقت فضا میں گردش کر رہے ہیں۔ خودکار دفاعی نظام اس حد تک ترقی کر گیا ہے کہ خود اپنے موجد کے اختیار سے آزاد ہوتا جا رہا ہے۔ اور کسی وقت بھی اپنے بنانے والے کے لئے ایک مسئلہ بن سکتا ہے۔ ان سب تیاریوں کی ضرورت اس لئے پڑی کہ صرف عقل کی راہنمائی نے انسان کو انسانیت کے راستے سے ہٹا دیا۔ قصور اس میں عقل کا نہیں ہے۔ عقل کا کام تو صرف موجود چیزوں کو سمجھنا اور جانچنا ہے۔ اس کو راہ نما بنا لینا اندھے کے پیچھے چل پڑنے کے مترادف ہے جو بار بار بھٹکتا ہے، گرتا ہے اور پھر انجانے راستے پر چل نکلتا ہے۔ اور دنوں کی مسافت سالوں میں طے کرتا ہے۔ لیکن انسان نے یہی کیا اور عقل کے بل بوتے پر اپنے نفس اور کائناتی قوتوں کو تسخیر کرنے نکل کھڑا ہوا۔ اور پھر عقل نے، جو دراصل اس کے جذبات کی لونڈی تھی، اس کو وہ چکر دیئے کہ وہ اپنی اصل حیثیت ہی بھول گیا۔ اور ایک غاصب، جابر اور ظالم مخلوق بن کر رہ گیا۔ حق و انصاف کا تعین، طاقت کے پیمانوں سے ہونے لگا۔ انسان نے انسان کا استحصال سیکھا اور غلامی نے جنم لیا۔ انسان کی روزی انسان کے ہاتھ میں آگئی۔ ایک طبقے نے دوسرے طبقے کا استحصال سیکھا۔ اور جاگیرداری اور سرمایہ داری نے جنم لیا۔ پھر قوموں نے قوموں کا استحصال شروع کیا۔ اور انسان کو وہاں لا کھڑا کیا، جہاں حیوان بھی شرم سے پانی پانی ہو جائے۔

ویٹ نام میں جو کچھ ہو رہا ہے کسی سے پوشیدہ نہیں؛ بے گناہ عورتوں، مردوں اور معصوم بچوں کا خون جس طرح بہایا جا رہا ہے اس نے چنگیز اور ہلاکو کو بھی مات کیا۔ کشمیر کے مسلمان ظلم و بربریت کا شکار ہیں۔ فلسطین، قبرص، رہوڈیشیا، جنوبی افریقہ، کیوبا، کانگو، عدن اور مشرق اوسط "امن پسند" قزاقوں کی لوٹ کی حرص و ہوس کا نشانہ بنے ہوتے ہیں۔ اور دنیا کی وہ انجمن جو دنیا میں حق و انصاف قائم کرنے کو وجود میں لائی گئی تھی، ان خودغرض ممالک کا سب سے موثر آلۂ کار بنی ہوئی ہے — نہ کوئی ظالم کو ٹوکنے والا ہے نہ مظلوم کا پرسانِ حال۔

بڑی طاقتیں؛ اقتدار اور منڈیوں کی رسہ کشی میں اس درجہ منہمک ہیں کہ اپنے ہاتھ سے اپنی تباہی کا سامان کر کے اپنی ہی تباہی سے بے خبر ہیں۔ اور قوت کے نشے میں سرشار مست ہاتھی کی طرح، دلدل کی طرف بڑھی چلی جا رہی ہیں۔

اس گھپ اندھیرے میں، سحر کی تمنا، مُردے کو جلانے کی تمنا کے مترادف معلوم ہوتی ہے۔ سحر کا تو لفظ ہی دنیا کے لئے اجنبی ہو کے رہ گیا ہے۔ وہ تو تاریکی کی عادی ہو گئی ہے۔ سحر کے تو نام سے ہی اس کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ اور خوف سے لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔

سامعین! یہ تھے وہ خیالات جو غیر محسوس طور پر میرے ذہن کے زیریں گوشے میں پیوست تھے، اور نہ جانے کب تک پیوست رہتے۔ اگر یہ عنوان میرے سامنے نہ آتا۔ اس موضوع کے سامنے آتے ہی، مایوسی کی یہ غیر محسوس کیفیت، ابھر کر سطح پر آگئی۔ جب تک یہ خیالات بکھرے ہوئے اور خوابیدہ تھے، ذہن کی سطح پُرسکون تھی۔ لیکن جب یہ ایک محسوس اور معین شکل اور ایک مصرعہ کی صورت میں سامنے آئی تو ذہن کا جھوٹا سکون متلاطم ہوگیا۔ شعور نے کچھ دیر تو آنکھیں ملیں اور پھر ایک دم اٹھ بیٹھا۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر دیکھا تو ہر طرف تحت الشعور نے مایوسی پھیلا رکھی تھی۔ بڑا پریشان ہوا، کیونکہ مایوسی اس کے لئے موت تھی۔ چنانچہ اس نے جھٹ چلانا شروع کر دیا کہ مایوسی کی ضرورت نہیں۔ سحر آنے والی ہے۔ لاشعور نے جو یہ سنا تو بڑا برہم ہوا کہ یہ کون بدتمیز اس کے کئے کرائے پر پانی پھیر رہا ہے۔ آنکھیں لال پیلی کر کے اٹھا۔ اور شعور کی گردن دبوچ لی کہ یہ کیا بکواس ہے دیکھتے نہیں دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ اور پھر کہتے ہو مایوس نہیں ہونا چاہیئے کچھ تو عقل سے کام لو۔

عقل کے نام پر شعور ایک دم چونکا۔ اور بولا "میاں لاشعور"! اگر تم تھوڑی دیر کو میری گردن چھوڑو، تو میں ذرا عقل سے مشورہ کر کے تمہیں کچھ جواب دوں۔ کیونکہ تم تو جانتے ہی ہو کہ اس کے بغیر تو میں بالکل بدھو ہوں۔

لاشعور کو یقین تھا کہ عقل اس کے ہی حق میں ہو سکتی ہے۔ چنانچہ جھٹ بولا۔ ہاں ہاں پوچھ لو عقل سے عقل کوئی بے عقل تھوڑا ہی ہے جو تمہیں بے عقلی کا مشورہ دے گی۔

چنانچہ شعور نے عقل کو بلا کر پوچھا کہ کیوں بھئی! تم کیا کہتی ہو بیچ اس مسئلے کے؟

عقل، جواب شعور کے تابع تھی اور جذبات کی لونڈی نہیں رہی تھی، پہلے تو تھوڑا سا مسکرائی، شعور کو ایک دو دفعہ اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ پھر بولی کہ تم تو واقعی بالکل بدھو ہو۔ ارے یہ تو بہت موٹی سی بات ہے کہ دنیا میں وہی چیزیں زندہ رہتی ہیں جن کے سامنے کوئی اعلیٰ مقصد ہوتا ہے۔ اور جو مسلسل مایوسی کا شکار ہوتے بغیر اس کی طرف بڑھتی رہتی ہیں۔ جہاں ان کے قدم رکے، وہیں ان کی موت ہے۔ اب بات بالکل صاف ہے۔ جب تک دنیا قائم ہے، ہم مایوس نہیں ہو سکتے۔ اور جس دن دنیا ختم ہوگی، ہم مایوس ہونے کے لئے یہاں نہیں رہیں گے۔ لہٰذا مایوسی اور ہم تو اکٹھے ہو ہی نہیں سکتے۔ شعور نے یہ باتیں لاشعور کو بتائیں تو اس نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا کہ حضرت کیا فلسفہ چھانٹ رہے ہو کہ جب ہم ہیں تو مایوسی نہیں ہو سکتی اور جب مایوسی ہوگی تو ہم نہیں ہوں گے۔ یہ تو سب طفل تسلیاں ہیں، تم وہ دیکھو جو ہو رہا ہے۔ حقائق کا مطالعہ کرو حقائق کا۔ تمہیں خود نظر آجائے گا کہ کہیں بھی سحر کے آثار نہیں ہیں۔

شعور نے عقل سے کہا کہ وہ تو یہ کہتا ہے۔ عقل نے تھوڑی دیر تو تامل کیا۔ پھر بولی۔ اچھا تھوڑی دیر ٹھہرو۔ میں ذرا دنیا پر ایک نظر ڈال آؤں کہ کیا واقعی کہیں سحر کے آثار نہیں ہیں؟ اور دنیا سے انسانیت ختم ہونے والی ہے؟ اس نے فوراً مشاہدہ، تجربہ، احساس، حافظہ اور دوچار اور ایسے ہی ضروری اوزار ایک گٹھڑی میں باندھے اور بین الاقوامی دورے پر روانہ ہوگئی۔

خیال کے پروں پر سوار جب اس نے سفر کا آغاز کیا تو ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اور زمین پر ایک چھوٹا سا نکتہ چمک رہا تھا۔ لیکن وہ آگے بڑھ گئی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ایک ایسے علاقے میں پہنچی جہاں ہر طرف روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اگرچہ چند ایک دھبے بھی نظر آرہے تھے لیکن اس نے دیکھا کہ وہاں کے لوگوں کو ان دھبوں کا کچھ خیال نہیں ہے اور سب اپنے اپنے فرض کی بجاآوری میں پوری توجہ سے لگے ہوئے ہیں۔ اس نے دیکھا کہ وہاں کے انسان سرمایہ داری، جاگیرداری اور انسانی محنت کے استحصال کی تاریکی سے آزاد ہو چکے ہیں۔ اور انہیں معاشی، سماجی، ذہنی، جذباتی اور فکری آزادی پوری طرح حاصل ہے۔ بچے سے لے کے بوڑھے تک ہر ایک کے چہرے پر مسرت و شادمانی کی چمک ہے، عدل و انصاف کا بول بالا ہے۔ انسان کو انسانیت کا درجہ حاصل ہے۔ نہ کوئی غلام ہے نہ آقا۔ سب انسان ہیں اور ایک دوسرے کے حقوق سے پوری طرح آگاہ۔ ہر ایک دوسرے کے لئے زندہ ہے۔ عقل کو یہ ماحول سحر کے تصور کے عین مطابق نظر آیا۔ وہ ذرا نیچے اتری اور تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ اس ملک کا نام چین ہے۔

کم و بیش یہی حال اس نے روس، رومانیہ، چیکو سلوواکیہ، ہنگری، پولینڈ، کیوبا، شمالی کوریا، اور شمالی ویٹ نام میں دیکھا۔ عقل کو یہ ممالک مطلوبہ سحر کے عین مطابق نظر آئے۔ اس نے ایک جگہ بیٹھ کر حساب لگایا تو یہ ممالک کل دنیا کا ایک تہائی ہے۔

پھر وہ ان ممالک میں پہنچی جن پر ہنوز سرمایہ داری، اور جاگیرداری کی تاریکی مسلط ہے۔ لیکن عقل نے محسوس کیا کہ اب اس گھمبیر تاریکی میں سے کہیں کہیں روشنی کی کرنیں جھلکنے لگی ہیں۔ جنوبی ویٹ نام، برما، لاؤس، تھائی لینڈ، انڈونیشیا، عرب ممالک، جنوبی افریقہ اور لاطینی امریکہ کی تمام ریاستیں، اسے آزادی کی جد و جہد میں مصروف، اور سحر کی طرف گامزن نظر آئیں۔

اس نے دیکھا کہ سامراجیوں کے ان داتا، امریکہ کا ایک پاؤں ویٹ نام میں اور دوسرا لاطینی امریکہ میں، اس بری طرح پھنسا ہوا ہے کہ اس امیر ترین معیشت کے قدم لڑکھڑانے لگے ہیں۔ پانچ لاکھ فوج، زہریلے مادے والے اسلحہ، اور نہایت سفاکانہ طرز جنگ کے باوجود، پانچ سال سے ویٹ نام نے امریکہ کے دانت کھٹے کر رکھے ہیں۔ امریکہ کا جانی اور مالی نقصان اتنا گہرا ہو گیا ہے کہ امریکی سرمایہ داروں کی نمائندہ سینٹ

تک بلبلا اٹھا ہے کہ باطنی چوٹ کا شکار ہو گئی ہے۔ پچھلے دو برس میں اتی اتی ہزار کے کئی جلوس، امریکی پالیسی کے احتجاج میں نکل چکے ہیں۔

دوسری طرف ۱۹۵۰ء میں کیوبا کی آزادی کے بعد، لاطینی امریکہ کی تحریکِ آزادی ایک نئے رنگ، اور توانائی کے ساتھ ابھر رہی اور پھیلتی جا رہی ہے اور امریکہ کے پٹھو ڈکٹیٹروں نے عجب وحشت کے عالم میں امریکہ سے فوجی اور مالی امداد مانگنی شروع کی ہے۔ گوریلا جنگوں نے کسانوں کی وسیع طاقت کی بنیاد پر، سامراجی آمریتوں کو، چند دن کا مہمان بنا دیا ہے۔

پھر عقل نے دیکھا کہ ظلمت اور تاریکی کی یہ قوتیں ایک طرف تو عوامی بغاوتوں کے گھیرے میں آ گئی ہیں اور دوسری طرف، سامراجی ملکوں کے آپس کے تضادات، خصوصاً فرانس کے ساتھ، مسلسل بڑھ رہے ہیں۔

عقل نے محسوس کیا کہ یہ سارا عمل فقط امریکہ کو ہی گوشۂ تنہائی میں دھکیلنے کو نہیں، بلکہ دنیا بھر کے مظلوم ممالک اور عوام کی آزادی اور سحر کے طلوع کا عمل بھی ہے۔

دنیا میں سحر کے یہ آثار دیکھ کر وہ خوشی خوشی واپس آئی اور شعور کو بتایا کہ دنیا کا ایک تہائی حصہ تو سحر سے ہمکنار ہو چکا ہے جس میں چین، روس، اور ان کے حواری شامل ہیں۔ ایک چوتھائی حصہ سحر کی طرف تیزی سے گامزن ہے اور باقی تقریباً نصف حصے میں عوام بیدار ہو چکے ہیں اور عنقریب جہدِ آزادی میں مصروف ہو جائیں گے۔

شعور نے فوراً لاشعور کو آواز دی تاکہ عقل کی یہ رپورٹ سنا کر اسے قائل کر سکے۔ مگر جواب ندارد! اب جو غور سے دیکھا تو حضرتِ دماغ کے ایک اندھیرے گوشے میں منہ سر لپیٹے، مزے سے پڑے خراٹے لے رہے ہیں۔ شعور نے جب دو تین دفعہ زور سے جھنجھوڑا تو جمائیاں لیتے ہوئے، برا سا منہ بناتے، اٹھ کر بیٹھ گئے۔

شعور نے ان کی بیزاری کو نظر انداز کرتے ہوئے عقل کے بتائے ہوئے تمام آثار کی تفصیل، ان کے گوش گذار کر دی۔

لاشعور کچھ دیر تو اس انداز سے شعور کی طرف دیکھتا رہا جیسے شعور کوئی چھوٹا سا بچہ ہو اور کوئی احمقانہ بات کر کے اپنے بزرگ سے اس کی داد چاہ رہا ہو۔ پھر بولا۔

شعور میاں! پہلے تو یہ بات غلط ہے کہ صرف معاشی مساوات کا حاصل ہو جانا ہی سحر ہے۔ پھر اگر تھوڑی دیر کو یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ صرف معاشی مساوات کا حصول ہی منتہائے مقصود ہے، تو اسکی

کیا ضمانت ہے کہ یہ تمام کوششیں بار آور ہی ہوں گی؟

بات میں وزن تھا۔ عقل سوچ میں پڑ گئی اور لاشعور کو بھی چپ ہونا پڑا۔

تھوڑی دیر بعد عقل اٹھی، اپنا غوطہ خوری کا لباس نکالا اور جلدی جلدی پہننے لگی۔ شعور نے بھی ہوئی نظروں سے لاشعور کی طرف دیکھتے ہوئے، جو بدستور اسے گھور رہا تھا، عقل سے کہا۔

"ارے تم اس مشکل وقت میں مجھے اکیلا چھوڑ کے کہاں جا رہی ہو؟ خدا کے لئے کچھ تو خیال کرو۔"

عقل بولی "گھبراؤ نہیں، میں تمہارے ہی کام کو جا رہی ہوں۔ ابھی آ جاؤں گی" اور پھر ایک تنبیہانہ نظر لاشعور پر ڈالتے ہوئے وہ فوراً ماضی کے عمیق سمندر میں غوطہ زن ہو گئی۔

کافی دیر ماضی کے سمندر میں تاریخ کے موتی چننے کے بعد وہ دوبارہ حال کی سطح پر ابھری تو شعور بے صبری اور لاشعور پریشانی کے عالم میں اس کے منتظر تھے کہ دیکھیں کیا خبر لاتی ہے۔

عقل نے سانس برقرار رکھتے ہوئے اور غوطہ خوری کے لباس سے اپنے آپ کو آزاد کرتے ہوئے کہا کہ "تاریخ شاہد ہے کہ ابتدائے آفرینش سے دنیا خیر اور شر کا اکھاڑا رہی ہے۔ اور مشیتِ ایزدی کے مطابق خیر ہمیشہ شر پر فتح مند رہی ہے اور انسانیت، ارتقائی عمل سے بہ سے بہتر ہوتی چلی گئی ہے۔

شعور نے بات کاٹتے ہوئے سوال کیا "ارتقائی عمل سے تمہاری کیا مراد ہے؟ ذرا وضاحت سے بتاؤ۔"

عقل بولی "ایک زمانہ تھا کہ لوگ گروہوں کی شکل میں رہتے تھے اور آگ تک سے ناآشنا تھے پھر انہوں نے آلاتِ پیداوار ایجاد کئے اور فاضل پیداوار شروع ہوئی جس کی وجہ سے طبقاتی تقسیم وجود میں آئی۔ اور غلام اور آقا پیدا ہوئے۔ غلاموں کی بے پناہ محنت سے سماج نے تہذیب کی اعلیٰ ترین منزلیں پائیں پھر غلاموں کی تعداد بڑھتی اور آقاؤں کی گھٹتی گئی۔ قدرت کا تغیر نواز ہاتھ حرکت میں تھا۔ چنانچہ جب غلاموں پر ظلم و ستم حد سے بڑھ گیا تو غلام بغاوتیں ابھریں اور آقاؤں کی آہنی مزاحمت کے باوجود غلاموں کی ہڈیوں پر بنائی ہوئی سلطنتیں ریت کی دیواروں کی طرح بیٹھ گئیں۔

غلاموں کا دور ختم ہوا تو جاگیرداری نظام وجود میں آیا۔ اس میں غلاموں کو کسی حد تک آزادی ضرور ملی لیکن ذاتی جائیداد کا تصور اب بھی موجود تھا۔ چنانچہ جاگیردار رفتہ رفتہ مضبوط اور مطلق العنان ہوتے چلے گئے بڑی بڑی جاگیروں اور شہنشاہیوں کی ابتداء ہوئی۔ اور جاگیرداری ظلم اور جبر گہرا اور مہیب تر ہوتا گیا۔ چنانچہ لوگ اس نظام کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ آزادی کی یہ توتیں بھی دنیاوی جابروں کے ہاتھوں رک نہ سکیں اور جمہوری دور سامنے آیا۔ اگرچہ جاگیرداری اور نوآبادیاتی "نظام" ختم ہو چکا تھا لیکن ذاتی ملکیت آزاد صنعتی جمہوری یعنی سرمایہ داری نظام میں بھی موجود تھا۔ اپنی حکومتوں کے استحکام کے بعد یہ [illegible]

جمہوری حکومتیں، آمریتوں میں بدل گئیں۔ وہ تحریکیں جو قومی آزادی کے نام پر شروع ہوئی تھیں، چند سرمایہ داروں کی آزادی اور تمام عوام کی غلامی پر منتج ہوئیں۔ چنانچہ قانونِ ارتقاء نے سوشلزم کو جنم دیا جس نے ذاتی ملکیت کے تصور کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔

آج دنیا بھر کے سرمایہ دار طبقے اپنے آپ کو امریکہ کے سامراجی سایے میں چھپا کر دنیا بھر کے عوام کی ابھرتی ہوئی سحر کو روکنے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ لیکن خود امریکہ' ویٹ نام کی مختصر آبادی کے ہاتھوں بُری طرح پِٹ رہا ہے۔ سرمایہ داری نظام کی ظلمت کا انجام موت ہے۔ ذاتی ملکیت کی بنا پر ابھرنے والا ظلم کا قلعہ گرنے والا ہے۔ دنیا کے عوام کی وہ جدوجہد جو مکمل معاشی، سماجی اور فکری نجات کے لئے ہے' جو سحر ہے، فتح مند ہونے والی ہے۔ جیسے پہلے شر نے شکست کھائی ہے' اب بھی خیر فتحمند ہوگی۔

عقل کی یہ تحقیق سن کر لاشعور تو کچھ سوچ میں پڑ گیا لیکن شعور کہنے لگا: "یہ تو مانا کہ دنیا غلامی، انسانی محنت کے استحصال اور ذاتی ملکیت کے اندھیروں سے نکل رہی ہے اور کئی ممالک میں دولت کی صحیح تقسیم اور عدل و انصاف کا نظام قائم ہو چکا ہے، لیکن انکار اس سے بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ معاشی مساوات کا نظام بھی کچھ دیرپا ثابت نہیں ہوا۔ ایسی مثالیں ہمارے سامنے آرہی ہیں جہاں یہ مساوات پھر ذاتی ملکیت اور معاشی اونچ نیچ کی طرف پلٹ رہی ہیں۔ اور سحر تاریکی کے دھبوں سے داغدار ہو رہی ہے۔ کیوں کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟

عقل کا چہرہ ایک دم بالکل سنجیدہ ہو گیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کی آنکھیں بہت دور کہیں خلا میں کسی چیز کو انتہائی حسرت و یاس سے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہوں۔ کچھ دیر بعد وہ ڈبڈبائی آنکھوں، اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی: "تم ٹھیک کہتے ہو۔ دنیا سحر کی طرف ضرور جا رہی ہے۔ لیکن یہ سحر ابدی نہیں ہے، کیونکہ اس کے سامنے محض مادی فلاح کا تصور ہے۔ انسانی ذات کی نشوونما سے یہ بالکل لاتعلق ہے اور جس نظام کا منتہائے مقصود انسانی ذات کی نشوونما نہ ہو' وہ کبھی مستقل ہو نہیں سکتا۔ اور اپنے عروج تک پہنچتے پہنچتے ہی تضادات کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور وہ نظام جو انسانی ذات اور اس کی مادی ضروریات دونوں کی فلاح کا نظام تھا' افسوس' اسے خود اس امت نے جس کی تحویل میں وہ دیا گیا تھا، ناعاقبت اندیشی، اور توسیع پسندی کے نشے کی نذر کر کے' اس کے طلوع ہوتے ہی' اسے غروب کر دیا۔ اور اب میری آنکھیں، بہت دور اسے ماضی کے دھندلکوں میں دیکھ رہی ہیں۔ وہی ایک نظام تھا جو دنیا کو اس نشیب و فراز کے چکر سے نکال کر سیدھے راستے پر گامزن رکھ سکتا تھا۔"

شعور نے تمام باتیں غور سے سن کر عقل سے کہا: "تم کہہ تو بالکل ٹھیک رہی ہو لیکن اصل بات یہ

تمہیں بتاتا ہوں۔ کیونکہ وہ شاید تم اپنے منہ سے نہ کہہ سکو۔ دراصل ساری گڑبڑ شروع وہاں سے ہوئی جہاں سے انسان نے تم کو وحی کا مقام دیا اور وحی کو چھوڑ کر تمہارے پیچھے چل پڑا۔"

"کیا مطلب؟" — عقل نے آنکھیں چمکا کر پوچھا۔

شعور نے اسی سنجیدگی سے کہا۔ "اس سے میرا مقصد تمہاری برائی کرنا نہیں ہے۔ بلکہ یہ بات تو تمہاری حمایت میں ہی ہے کہ ایک طرف تو انسان نے تم پر تمہاری ہمت سے زیادہ کام ڈال کر تمہیں بدنام کیا اور دوسری طرف خود اپنے آپ کو گمراہ کیا۔ اور جو چیز اصل راہ دکھانے والی تھی، اسے طاقِ نسیاں کی نذر کر دیا۔"

عقل نے سوچ میں ڈوبی آنکھیں اٹھائیں۔ اور بولی۔ "اس میں برا ماننے کی کوئی بات نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ مجھے میری حیثیت سے زیادہ جگہ دی گئی اور جس کا حق تھا اس سے ناانصافی ہوئی۔ اسی لئے اب جہاں بھی سویرا ہوتا ہے، موت کی طرح رات اسکے پیچھے لگی رہتی ہے۔"

لاشعور نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور طنزیہ لہجے میں کہنے لگا۔ "اب بولو۔ میں نہ کہتا تھا کہ اب سحر کی توقع فضول ہے۔"

عقل نے تھوڑی دیر اس کی طرف سنجیدگی سے دیکھا اور پھر اطمینان سے بولی۔ "نہیں! تم غلط کہتے ہو۔ میرا بتایا ہوا راستہ بالآخر پہنچے گا وہیں جہاں وحی کا بتایا ہوا پہنچتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ذرا لمبا ہے اور وقت زیادہ لیتا ہے۔"

"اندازاً کتنا وقت؟" شعور نے بےچینی سے پوچھا۔

عقل نے کہا۔ "اس کا اندازہ تو خود مجھے بھی نہیں۔ میرا طریق تو تجرباتی ہے۔ جو چیز سامنے آتی ہے، اسے پرکھتی ہوں، جانچتی ہوں، ایک رائے قائم کرتی ہوں۔ پھر اسے آزماتی ہوں۔ اگر تجربہ ٹھیک ہو، تو انسانیت کی بھلائی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ورنہ بعد خرابی بسیار، پھر نئے سرے سے تجربہ شروع کرتی ہوں۔ اس طرح قدم بقدم، اندھیرے میں ٹٹولتی ہوئی آگے بڑھتی ہوں۔"

اچانک عقل خاموش ہو گئی جیسے کچھ یاد آیا ہو۔ پھر یہ کہہ کر میں ابھی آتی ہوں، ایکدم پرواز کر گئی۔ شعور اور تحت الشعور سخت حیران تھے کہ یہ کہاں چلی گئی؟

کچھ دیر بعد وہ واپس آئی تو چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا اور آنکھیں امید کی روشنی سے منور تھیں۔

شعور اور لاشعور سوالیہ نشان بنے اسے تک رہے تھے۔ چڑھے ہوئے سانس پر بمشکل قابو پاتے ہوئے عقل بولی۔ "اب اندھیرے چھٹ جانے میں کوئی شبہ نہیں رہا۔ رب العالمین کا وہ نظام جسے طلوع ہونے کے ساتھ ہی ڈبو دیا گیا تھا، اب پھر ایک جگہ سے طلوع ہو رہا ہے۔

شعور تو یہ خبر سنکر بہت خوش تھا لیکن لاشعور ذرا سٹپٹا رہا تھا۔ کہنے لگا "کیا کہہ رہی ہو تم ؟ کہیں مُردے بھی زندہ ہوتے ہیں ؟ ضرور تمہارے اندر کچھ فتور آگیا ہے"

عقل نے کہا "سنو ! میں بتاتی ہوں کہ ہوا کیا۔ تمہیں یاد ہوگا جب میں سحر کے آثار کی تلاش میں اپنے پہلے سفر پر گئی تھی، تو اڑتے ہی ایک جگہ میں نے کوئی چھوٹی سی چمکتی ہوئی چیز دیکھی تھی۔ آج تم سے باتیں کرتے کرتے اچانک مجھے اس کا خیال آیا اور میں نے سوچا کہ کیوں نہ ذرا دیکھ آؤں کہ وہ ہے کیا۔ اب جو وہاں گئی تو حیران رہ گئی۔ میز پر ایک کتاب رکھی تھی اور اس میں سے نور کی کرنیں نکل نکل کر ایک شخص کے دماغ میں داخل ہو رہی تھیں۔ اور الفاظ میں ڈھل ڈھل کے اس کی زبان سے ادا ہو کر اردگرد بیٹھے ہوئے لوگوں کے کانوں کے راستے دل میں داخل ہو رہی تھیں اور دلوں کو منور کر رہی تھیں۔ یہ وہی نور تھا جو چودہ سو سال پہلے خدا نے انسان کو عطا کیا تھا لیکن وہ اس وقت عالمگیر انسانیت کی گرفت میں پوری طرح نہیں آسکا تھا۔ اسکا صرف ایک ڈھانچہ سا ذہنوں پر نقش ہو کر رہ گیا تھا اور روح غائب ہو گئی تھی"

پھر عقل نے کہا۔ "اب ایک طرف تو دنیا میرے راستے سے اندھیروں کو چھانٹ رہی ہے اور سحر کے آثار پیدا ہو رہے ہیں اور دوسری طرف اس آنیوالی سحر کو دوام بخشنے کے لئے وہ نظام طلوع ہو رہا ہے جس کا خالق رب العالمین اور جس کا ذریعہ وحی ہے اور جو قرآن شریف کی شکل میں موجود ہے۔

لاشعور کے چہرے پر پہلی مرتبہ اطمینان کے آثار پیدا ہوئے ۔۔۔ شعور نے عقل سے کہا۔ مجھے فوراً وہاں لے چلو جہاں وہ نور پھوٹ رہا ہے۔ پھر اس نے لاشعور کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اسے بھی چلنے کی دعوت دے رہا ہو۔ لاشعور نے معذرت آمیز لہجے میں کہا "بھائی، بات یہ ہے کہ برسوں کی پڑی ہوئی مایوسی کی عادت آخر جاتے جاتے ہی جائیگی۔ تم لوگ چلو اور مجھے تھوڑی سی مہلت دو میں بعد میں آجاؤنگا۔ شعور اور عقل ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے خوشی خوشی اسطرف چل پڑے جدھر لو پھٹ رہی تھی۔

---

(۷)

بیگم خضر عارفی

آثار بتاتے ہیں سحر ہو کے رہے گی!

محترمہ بیگم خضر عارفی نے مقالہ نہیں پڑھا تھا بلکہ برجستہ تقریر کی تھی۔ تقریر اس قدر عالمانہ، ادیبانہ، دلکش، رواں، شگفتہ اور شاداب امیدوں کی نشید حیات آور کا مرقع تھی کہ سامعین محو حیرت بھی تھے اور منہمک

جذب وکیف بھی۔ ہمیں افسوس ہے کہ تقریر کے ٹیپ ریکارڈ پر محفوظ کرنے کا انتظام نہ ہو سکا۔ اس لئے ہمارے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ ہم قارئین طلوع اسلام کو اس سے محروم رکھنے پر دلی معذرت پیش کر کے آگے بڑھ جائیں۔

---

(۸)

محترم سراج منیر

آثار بتاتے ہیں سحر ہو کے رہیگی

محترمہ صدر صاحبہ! و معزز حاضرین! السلام علیکم۔

ع ــــ "آثار بتاتے ہیں سحر ہو کے رہیگی" ــــ کا موضوع بادی النظر میں کس قدر آسان اور بنظر تعمق کس قدر مشکل! ایک عام فہم انسان کی نظر میں شام و سحر کا تغیر محض زمین کی محوری گردش کا نتیجہ ہی ہو سکتا ہے۔ مگر حقیقت شناس نگاہیں جانتی ہیں کہ یہ آثار اسی وقت پیدا ہو سکتے ہیں جب ان کی کوششوں اور ہمتوں کی حدود اس مقام تک پہنچ جائیں۔ ع

کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

انسانیت کی شب تاریک کو منور کرنے کے لئے جو ستارے آج افق پر نظر آ رہے ہیں میں ان میں سے چند ایک کی نشاندہی کروں گا۔ واللہ المستعان!

انسانی مسائل میں سب سے بڑا مسئلہ روٹی کا ہے۔ انسان نے اس کا کیا حل سوچا ہے؟ اس کے نتیجے میں آج دو متضاد معاشی نظام ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں۔ نظامِ سرمایہ داری اور نظامِ اشتراکیت!

نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ افراد کو ذاتی ملکیت کا غیر محدود حق حاصل ہے اور یہ ملکیت روزمرہ کی اشیائے ضروریات تک ہی محدود نہیں بلکہ وسائل پیداوار بھی سب اس میں شامل ہیں۔ افراد اس معاملہ میں آزاد ہیں کہ وہ قیمت ادا کر کے جس چیز کو چاہیں اپنی ملکیت میں لے آئیں۔ یہ اس چیز سے جس طرح جی چاہے متمتع ہوں۔ جسے چاہیں اس سے فائدہ اٹھانے دیں اور جس پر چاہیں اس کے دروازے بند کر دیں۔ جو جی میں آئے بنائیں اور انہیں جن داموں چاہیں فروخت کریں۔ معاشرہ کو کوئی حق حاصل نہیں کہ افراد کی اس آزادی میں کسی قسم کی مداخلت کرے۔ اس نظام کو عین فطرتِ انسانی کے مطابق قرار دیا جاتا

ہے۔ اس لئے کہ مختلف اشیاء کو "میری" کہنا انسانی فطرت کا بنیادی جذبہ ہے۔ اور "میری اشیاء" میں ایک دوسرے سے مسابقت کا جذبہ اس کی تمام توانائیوں کا محرک۔ لہٰذا حکومت کو کوئی حق نہیں کہ وہ انسانی فطرت کے ان جذبات کی تسکین میں خواہ مخواہ مزاحمت کرے۔ اسے صرف یہ دیکھنا چاہیئے کہ مختلف سرمایہ دار حکومت کے عاید کردہ ٹیکسوں کو ادا کرتے ہیں یا نہیں ---- اس کے بعد حکومت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ان معاہدات کی نگہداشت کرے جو سرمایہ دار اور مزدوروں کے درمیان (اجرت وغیرہ کے سلسلہ میں) طے پاتے ہیں۔ حکومت کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ یہ معاہدے اس قسم کی شرائط پر مشتمل ہونے چاہئیں ---- ان معاہدوں کا پس منظر یہ ہوتا ہے کہ پہلے مزدوروں کے لئے ایسے حالات پیدا کر دیئے جاتے ہیں جن سے وہ فاقوں مرنے لگ جاتے ہیں۔ جب وہ بھوک سے تنگ آ جاتے ہیں تو ان کے سامنے کام کی شرائط رکھ دی جاتی ہیں۔

اس نظام کی رُو سے مزدور کی حیثیت کیا ہو جاتی ہے۔ اسے "ریکارڈو" (RICARDO) کی زبانی سنیئے۔ وہ کہتا ہے کہ

> "مزدور کی فطری اجرت صرف اس قدر ہے جس سے وہ زندہ رہ سکے اور اپنی نسل کو اس طرح باقی رکھ سکے کہ وہ نہ تو کم ہونے پائے اور نہ زیادہ۔"

(THE PRINCIPLES OF POLITICAL THEORY AND TAXATION.)

یہ نظام روٹی کے مسئلے کو حل کیا کرتا بلکہ روٹی کا موجودہ مسئلہ اسی نظام کا پیدا کردہ ہے اور زندگی کی شبِ تار میں ایک اور ظلمت کا اضافہ ہے۔

اس نظام کے خلاف ایک ردِ عمل شروع ہوا جسے اشتراکیت کا نام دیا جاتا ہے اور جو اپنی متشدد شکل میں کیمونزم کا روپ دھار چکا ہے۔

نظامِ اشتراکیت کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ ہر شخص سے اس کی استعداد کے مطابق کام لیا جائے، اور اس کی ضرورت کے مطابق اسے معاوضہ دیا جائے۔ ایک شخص کے کام کی قیمت پانچ روپے ہے اور اسکی ضروریات سات روپے میں پوری ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ شخص اس نظام میں بہت خوش رہے گا۔ لیکن ایک شخص کے کام کی قیمت سات روپے ہے اور اس کی ضروریات تین روپے میں پوری ہو جاتی ہیں۔ یہ دیکھتا ہے کہ اسے دن بھر محنت کرنا پڑتی ہے اور شام کو اس کی کمائی میں سے چار روپے کسی اور کو دے دیئے جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ شخص اس نظام میں کیوں رہے؟ ---- وہ کیوں نہ سات کے سات روپے اپنی ذات پر خرچ کرے یا اگر اسے تین روپے یومیہ ہی خرچ کرنے ہیں تو وہ کیوں سارا دن محنت کرے۔ وہ ایک دو گھنٹے کام کرے جس سے اسے تین روپے کی یافت ہو جائے اور باقی وقت آرام کرے۔

زائد از حاجت کمانا ہے عبث !

بالفاظ دیگر سوال یہ ہے کہ وہ کون سا جذبہ ہے جس کے ماتحت یہ شخص اس قدر ایثار کرتا رہے۔ اور اس میں اطمینان محسوس کرے ؟ ——

کمیونزم کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ... ... اور مادی نظریۂ زندگی جس پر کمیونزم کے فلسفہ کی عمارت استوار ہوتی ہے کی رو سے اس کا کوئی جواب ممکن بھی نہیں۔

نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ کارکن اور محنت کش اپنی پوری استعداد کو بروئے کار نہیں لاتے اور وہ کچھ نہیں ہو پاتا جو ہو جانا چاہیئے۔ مزدور کو کام پر آمادہ کرنے کے لئے ایک ہی حربہ رہ جاتا ہے اور وہ ہے تشدد وہی ظلم و تشدد جس کے خلاف اشتراکیت آواز اٹھاتی ہے۔ اس نظام کی بنیاد نفرت اور انتقام پر استوار ہوتی ہے۔ یہ نظام، تشدد کے زور پر قائم ہوتا اور تشدد ہی کے ذریعے قائم رکھا جاتا ہے۔

یہ نظام معاشرے کی ناہمواریاں دور کرتا ہے اور انہیں دور ہونا چاہیئے کہ یہ باعثِ ننگِ انسانیت ہیں۔ لیکن یہ انسان سے کیا چھین لیتا ہے اسے ڈاکٹر لوکنز (DR. G. LUCHNZ.) کی زبانی سنیئے۔

> اشتراکی اخلاق کی رو سے یہ فریضہ سب سے اہم ہے کہ اسے تسلیم کیا جائے کہ عند الضرورت بددیانتی اور بے ایمانی سے کام لیا جا سکتا ہے۔ یہ سب سے بڑی قربانی تھی جس کا ہم سے انقلاب نے مطالبہ کیا تھا۔

(OUR THREATENED VALUES BY GOLLANCZ)

ایں خدا ناں دہد، جاں ستد

یہ ہیں چکی کے وہ دو پاٹ، جن سے اس وقت انسانیت محض روٹی کے مسئلے کی خاطر بری طرح پس رہی ہے۔ انسانیت کی تاریخ میں اس سے تاریک تر دور شاید ہی کبھی آیا ہو۔ اور انسان ہے کہ اسے اپنے اس مسئلہ کا اور کوئی حل نہیں سوجھتا۔

انسان کی دوسری مشکل یہ ہے کہ اس کا جذبۂ تغلبِ خویشتن کسی طرح قابو میں نہیں آرہا۔ ہر کوئی یہ چاہتا ہے کہ وہ دوسروں پر اپنا حکم چلائے۔ بادشاہ، حکمران، سلطان، ڈکٹیٹر، قوت کے ذریعے دوسروں پر اپنا حکم چلاتے ہیں۔ سرمایہ دار اپنی دولت کے زور پر محنت کشوں کو محکوم بنا رہا ہے۔ ذہین اور ہوشیار قسم کے آدمی، اپنی عقل کے زور پر کم عقل لوگوں اور عوام پر اپنے جذبہ حکومت کی تسکین کرتے ہیں —— اس معاملے میں فرعون، قارون اور ہامان ایک ہی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ انسان نے اس مشکل

کے حل اور نظمِ باہمی کے سلسلے میں بہت سے تجربات کئے ہیں ــــ ملوکیت ، امرا کی حکومت ، تھیاکریسی ، اور جمہوریت وغیرہ ــــ تین اول الذکر تجرباتِ انسانی کے دیئے ہوئے دکھوں سے تنگ آکر عقل نے جمہوریت کا راستہ تلاش کیا ہے۔ اور آجکل اسے آیۂ رحمت سمجھا اور کہا جاتا ہے۔ اس کی تائید کرنے والوں کو حق و صداقت کے شاہد اور نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کا معاون خیال کیا جاتا ہے اور اس کی مخالفت کرنے والوں کو انسانیت کا مجرم اور خدا کا دشمن تصور کیا جاتا ہے۔ اسے انسانی ذہن کے سامنے کچھ اس انداز سے پیش کیا جاتا ہے گویا اسے آسمانی سند حاصل ہے۔ جمہوریت کی بنیاد حسب ذیل مفروضات پر ہوتی ہے۔

(۱) اس اندازِ حکومت میں حاکم اور محکوم کا امتیاز باقی نہیں رہتا۔ اس میں ــــ "عوام کی حکومت عوام کے مفاد کی خاطر، عوام ہی کی وساطت سے" ــــ کا اصول کارفرما ہوتا ہے۔

(۲) عوام کا منشاء ان کے نمائندگان کے ذریعہ معلوم ہو سکتا ہے۔

(۳) کسی چیز کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار ان نمائندگان کی کثرتِ رائے پر ہوتا ہے۔

(۴) اقلیت کو اکثریت کے فیصلے صحیح تسلیم کرنے پڑتے ہیں۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اتنی مدت کے تجربہ نے اس نظام کو فی الواقع بہترین نظام ثابت کر دیا ہے؟ یہ نظام اول اول مغرب میں رائج ہوا۔ اس لئے اس کے متعلق صحیح رائے بھی مغرب کے مفکرین ہی پیش کر سکتے ہیں۔ چنانچہ میں آپ کے سامنے نظامِ جمہوریت کے مشہور اطالوی مدبر میزینی کے خیالات پیش کرتا ہوں۔

"اس میں شبہ نہیں کہ عام رائے دہندگی کا اصول بہت اچھی چیز ہے۔ یہی وہ قانونی طریق کار ہے جس سے ایک قوم تباہی کے مسلسل خطرات سے محفوظ رہ کر اپنی حکومت آپ قائم رکھ سکتی ہے۔ لیکن ایک ایسی قوم میں جس میں وحدتِ عقاید نہ ہو، جمہوریت اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی ہے کہ وہ اکثریت کی نمائندگی کرے اور اقلیت کو مغلوب رکھے۔ ہم یا تو خدا کے بندے بن سکتے ہیں یا انسان کے۔ وہ ایک انسان (ملوکیت) ہو یا زیادہ (جمہوریت)۔ بات ایک ہی ہے۔ اگر انسانوں کے اوپر کوئی اقتدارِ اعلیٰ نہ ہو تو پھر کون سی چیز ایسی رہ جاتی ہے جو ہمیں طاقت ور افراد کے تغلب سے محفوظ رکھ سکے۔"

(QOUTED BY GRIFFITH IN ــــ INTERPRETTERS OF MAN.)

مینکن کے الفاظ میں :-

نظری طور پر حکومت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ افراد مملکت کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ ہے۔ اور اربابِ حکومت، پبلک کے خدام ہیں۔ لیکن درحقیقت حکومت کا فریضہ پبلک کی خدمت نہیں بلکہ سلبِ نہب ہوتا ہے۔

اس باب میں مختلف اسالیبِ حکومت میں سب سے زیادہ ناکام، نظامِ جمہوریت رہا ہے۔ جمہوری نظام کے اربابِ حل و عقد خوب جانتے ہیں کہ حکومت کی بنیاد معقولیت پر ہونی چاہیئے۔ لیکن ان کا جذبۂ محرکہ کبھی معقولیت پسند نہیں ہوتا۔ ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ جو عنصر بھی باہر سے زیادہ دباؤ ڈال سکے، اس کا ساتھ دیا جائے چنانچہ اس ہتھکنڈے سے، وہ ان لوگوں کے توسط سے جو فی الحقیقت پبلک کے دشمن ہوتے ہیں، غیر مختتم عرصہ تک برسرِ اقتدار رہتے ہیں۔

(TREATISE ON RIGHT AND WRONG.)

ان دو آراء سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ جس نظامِ سیاست کو انسانی مشکلات کا آخری حل سمجھا جا رہا ہے وہ انسانی یومِ زندگی کا خورشید نہیں بلکہ اس کی شبِ تاریک کا ایک ٹمٹماتا ستارہ ضرور ہے جو آمدِ خورشید کا پتہ دے رہا ہو۔

آج انسانیت قوموں میں منقسم ہے۔ تحفظ و تغلب و خویش کے جذبات جب افراد سے آگے بڑھ کر قوموں کی سطح پر کارفرما نظر آنے لگیں تو تباہی و بربادی کا بھیانک سماں بندھتے دیر نہیں لگتی۔ گزشتہ دو ہولناک عظیم جنگیں اسی جذبہ کی رہینِ منت ہیں۔ اس کا حل انسان کی سمجھ میں یہ آیا ہے کہ قومیں مل بیٹھ کر متنازعہ معاملات حل کر لیں۔ اور یوں انٹرنیشنلزم کی بنیاد پڑی۔ لیکن لیگ آف نیشنز جس بُری طرح ناکام ہوئی اور آج اقوامِ متحدہ جس طرح مفلوج ہو رہی ہے، انسانیت کی شبِ تاریک کے ایک درخشندہ ستارہ کو ڈوبتا دیکھ کر قلبِ حساس پکار اٹھتا ہے کہ ۔۔۔ لا احب الآفلین!

سنیئے، اس بارے میں مسٹر ایمری ریوز (EMERY REVES) کیا کہتا ہے۔ وہ اپنی کتاب (THE ANATOMY OF PEACE.) میں رقمطراز ہے:۔

کہ ہم انٹرنیشنلزم سے کافی کھیل چکے ہیں۔ جو مسئلہ دنیا کے سامنے پیش ہے وہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو قوموں کے حل کرنے کا ہو (وہ تو خود قوموں کا پیدا کردہ ہے) وہ مسئلہ یہ ہے کہ نیشنلزم کے نظریہ نے انسانی معاشرہ میں ایک فساد برپا کر دیا ہے۔ لہٰذا کیسے ممکن ہے کہ خود نیشنلزم، خواہ وہ انٹرنیشنلزم ہی کیوں نہ بن جائے، اس

کا حل دریافت کرنے۔ اس مسئلہ کا حل انسانی عالمگیریت میں ہے۔ ایک ایسا عقیدہ جس کا مقصد یہ ہو کہ وہ قومیت اور بین الاقوامیت کی سطح سے اوپر جا کر، خالص انسانی سطح پر دنیا میں امن قائم کرنا چاہتا ہے۔ (صفحہ ۱۴۴)

یہ ہیں شب انسانیت کے آسمان پر درخشندہ ستارے جو افسردہ ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن انسان ان ٹمٹماتے ستاروں کو بنظرِ حیرت دیکھ رہا ہے اور کسی طلوعِ سحر کا منتظر ہے۔ سفرِ زندگی میں ان کا یوں دم توڑنا اس بات کی علامت ہے کہ یہ اُفق پار سے ابھرنے والے کسی منبع روشنی کے لئے جگہ خالی کرنا چاہتے ہیں۔

انسان جس صبح کا انتظار کر رہا ہے نہ جس دورِ جنت بداماں کی راہ میں دیدہ و دل فرشِ راہ کرنے کو تیار ہے اس کا تصور جوڈ کے ان الفاظ سے لگائیے۔ وہ کہتا ہے کہ

> مثالی معاشرہ وہ ہے جس میں ہر شخص وہ کام کرنا چاہے جسے وہ حق سمجھتا ہے اور ہر شخص اسی کو حق سمجھے جو درحقیقت حق ہے۔ بالفاظِ دیگر وہ معاشرہ جس میں لوگ ان کاموں کو حق سمجھیں اور ان پر عادتاً پابند ہوں جو بہترین نتائج کے حامل ہوں یعنی جو مستقل اقدار حسن، صداقت، اخلاقی محاسن اور انبساط کے مظہر ہوں جس معاشرہ کے افراد ان اقدار کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دیں گے اور ان پر عمل پیرا ہونگے وہی معاشرہ بہترین معاشرہ ہوگا۔

(GUIDE TO THE PHILOSOPHY OF MORALS AND POLITICS.)

اور BRIGHT MAN کے الفاظ ہیں۔

> یہ معاشرہ ان آزاد لوگوں پر مشتمل ہوگا جو ایک معقول اور قابلِ قدر واحد نصب العین کے حصول کے لئے باہمی تعاون و تناصر سے کام لیں۔ وہ نصب العین جس کی بنیادیں خدا کے ایمان پر استوار ہوں۔

اس وقت حالاتِ زمانہ ایک دورِ جدید کے متقاضی ہیں۔ انسان ایک مثالی معاشرہ کا قیام کرنے والوں کیلئے چشم براہ ہے۔ پرانے نظام کچھ دم توڑ چکے اور کچھ منتشر ہونے کو ہیں۔ اس وقت کائنات آدم کے لئے ایک نیا جہاں تعمیر کرنے کی فکر میں ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ کائناتی قانون ایک مثالی جہان بسانے کے لئے مدتوں سے محوِ خرام ہے۔ اس کی رفتار ممکن ہے چند صدیاں اور لے جائے۔ تو کیا انسان کو مزید کائناتی تجربات و حوادث کا شکار بننے دیا جائے۔ ایسا نہ ہونا چاہیئے۔ تو پھر اس دور کو جلد تر لانے کے لئے طریق کار کیا ہے۔

گوئٹے کہتا ہے کہ :-

انسانیت کا ارتقاء ایک مخصوص گروپ کی وساطت سے ہی عمل میں آسکتا ہے۔ یہ گروپ باقی نوعِ انسانی پر اثر انداز ہوگا اور اس کی راہنمائی کریگا۔

گورجیف کہتا ہے کہ اگر دنیا میں اس قسم کے دوسو باشعور انسان بھی مل جائیں جو اس طرح وحدتِ مقصد سے پہلے اپنے اندر ارتقائی کیفیت پیدا کرلیں اور اس کے بعد نوعِ انسانی کی راہنمائی کا بیڑہ اٹھائیں۔ تو وہ ساری دنیا میں انقلاب برپا کرسکتے ہیں۔

معزز حاضرین! میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ انقلاب کے لئے دوسو آدمی کافی ہوں گے یا کم وبیش۔ انسان کے لئے دارالامن تعمیر کرنے اور مثالی معاشرہ کے قیام کے لئے خدا کے چند بندوں نے وحدتِ مقصد کو سہارا بنا کر سفر کا آغاز کردیا ہے۔ اور چند سالوں کی رفاقت کے حوصلہ افزا اثرات اس طرح مرتب ہورہے ہیں کہ پاکستان میں خدا کے پیغام قرآنِ حکیم پر مبنی فہم وعمل کی سطح گزشتہ چند سالوں سے بدرجہا بہتر ہوچکی ہے۔ اور ہر طرف سے قرآنی معاشرہ کے قیام کے لئے صدا بلند ہورہی ہے۔

سفر کا آغاز ہوچکا ہے۔ خدا اور اس کی کائناتی قوتیں تعاون پر آمادہ ہیں۔ ابتدائی نتائج سامنے آرہے ہیں۔ تو کیوں نہ میں آپ ہی سے پوچھوں کہ ــــ

اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ؟

ــــ فَانْظُرْ اِلٰى اٰثَارِ رَحْمَةِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ــــ ! اور ملتِ اسلامیہ کے ہر نوجوان سے کہوں کہ ؎

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اس لئے کہ ــــ

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

والسلام !

(۹)

(عزیزہ) عفت خلیل

آثار بتاتے ہیں سحر ہو کے رہے گی

صدر محترمہ اور میرے بزرگو!

میں ایک سٹوڈنٹ ہوں اور موضوعِ مذاکرہ ایک ایسا سوال جس کے لئے میرا علم و مطالعہ یقیناً محدود ہے۔ لیکن خوش قسمتی سے سال گزشتہ مجھے اپنے والدِ بزرگوار کی معیت میں بیرونِ پاکستان مشرق و مغرب کے متعدد ممالک میں جانے کا موقعہ ملا۔ اس طویل سفر کے دوران وہ روشنی جو طلوعِ اسلام کی قرآنی قندیل نے مجھے دے رکھی تھی، آثار سے نہیں بلکہ عینی مشاہدات سے نشاندہی کرتی رہی کہ "سحر ہو کے رہے گی"۔

ایک عرصہ ہوا میں نے علامہ اقبالؒ کا یہ شعر سنا تھا ؎

فردوس جو تیرا ہے کسی نے نہیں دیکھا!
افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کی مانند!

اور خیال کرتی تھی کہ ان ممالک کے شہروں اور بستیوں میں مسرت و شادکامی واقعتاً جھولے جھولتی ہوگی۔ اور ہر فرد کو اس "فردوس کے مانند" ماحول میں دل کی خوشی اور قلب کا اطمینان تو ضرور حاصل ہوگا اور تمام افرادِ معاشرہ ایک دوسرے کے ساتھ گہری ہمدردی رکھتے ہوں گے۔ نہ صرف یہ بلکہ جس نفسا نفسی کا ہم اپنے ہاں رونا روتے رہتے ہیں وہاں اس کا نام تک نہ ہوگا۔

لیکن تہذیبِ یورپ و امریکہ کے ان گہواروں کو جنہیں دنیائے آزاد (FREE WORLD) کہا جاتا ہے اور جن میں اب کچھ ممالک مشرقِ بعید اور مشرقِ وسطےٰ کے بھی شامل ہو چکے ہیں، جب چشمِ بصیرت سے دیکھئے تو صاف نظر آتا ہے کہ ہر جگہ انسان کی عقلِ فریب کار نے استعماریت کا ہمرنگِ زمین جال پھیلا رکھا ہے۔ بظاہر تو ان کی فلک بوس عمارتیں (SKY SCRAPERS) ہوٹل، کارخانے، مزین بازار (SUPER MARKETS) اور سیرگاہیں ایک ہمہ گیر خوشحالی کا نشان معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن اس دولت و ثروت کے مالک یا مختار کار تمام تر بڑے بڑے تاجر (بالخصوص یہودی)، اُن کے بنک اور کمپنیاں ہیں۔ جن کی من مانی سے معاشرہ کا سوادِ اعظم اسی طرح پس رہا ہے جیسے کم ترقی یافتہ ملکوں میں جاگیرداروں کے ہاتھوں۔

اس میں شک نہیں کہ ان میں سے اکثر ممالک میں بڑی بڑی صنعتوں اور ان کے ساتھ ساتھ ٹریڈ یونینوں کے روز افزوں قیام و استحکام کی بدولت رہنے سہنے کا معیار یعنی (Physical Living - Standard) اونچا کر دیا گیا ہے، لیکن کس قیمت پر؟ اس کی وضاحت کے لئے چند چشم دید حالات عرض کروں گی۔

(۱) دولت کی اس قدر فراوانی کے باوجود یہ دیکھا گیا کہ کثیر تعداد میں لوگ مختلف طبقوں کے ہوٹلوں میں گزر اوقات کرنے پر مجبور ہیں۔ یا پھر کرایہ کے کمروں میں جہاں فرنیچر اور سامانِ آرائش بھی اکثر و بیشتر کرایہ پر یا HIRE PUCHASE پر لیا جاتا ہے جس کی ادائیگی کی اقساط میں سود اور قیمت شامل ہوتی ہے اور اس کی ادائیگی اگر کسی اُفتاد کی وجہ سے رُک جائے تو مالک سامان اٹھا کر لیجانے کا مجاز ہوتا ہے اور ادا شدہ اقساط بھی ضبط کر سکتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ مکانات و ہوٹل سب سرمایہ داروں کی ملکیت ہیں۔ ایک اوسط درجے کے گھرانے میں میاں بیوی دونوں ملازمت کر کے بھی بدقت اپنا خرچ چلاتے ہیں اور اگر وہ کچھ پس انداز کر کے اپنی ضروریات کے مطابق مکان تعمیر کر بھی لیں تو وہ اسے ریٹائرمنٹ کی عمر کے بعد نہیں رکھ سکتے۔ چونکہ مکان کا ٹیکس ادا کرنے کے لئے اُن کی انشورنس پنشن کافی نہیں ہوتی۔ اس لئے ریٹائرمنٹ کے بعد پنشنر کو پھر کسی کرایہ کے کمرے کی تلاش ہوتی ہے اور وہ اپنے معمول سے کم درجہ کی بود و باش پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ کھانے کے لئے بھی وہ گھٹیا درجے کے "سیلف سروس" (SELF - SERVICE) ہوٹلوں میں جاتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس مفادِ خویش کے ماحول میں بوڑھے بوڑھیاں مفت کا بوجھ خیال کئے جاتے ہیں اور اُن کے اپنے بیٹے بیٹیاں بھی اُن سے کنارہ کش رہتے ہیں۔ حالانکہ اس عمر میں سن رسیدہ لوگ زیادہ توجہ اور خدمت کے مستحق ہوتے ہیں، جیسا کہ قرآنِ کریم میں ارشاد ہوا ہے۔

(۲) اگرچہ مغرب کی تہذیب نو میں عورت کے احترام اور برتری یعنی (BETTER HALF) ہونے کا بہت ڈھول پیٹا جاتا ہے لیکن حقیقت آج بھی اس کے خلاف ہے۔ مغربی معاشرہ میں ہر وہ عورت جو کامیاب ازدواجی زندگی سے محروم رہ جائے یا بطور سیلز گرلز (SALES GIRLS)، رقاصہ، فلم آرٹسٹ یا کسی استقبالیہ آسامی میں کوئی مقام نہ پا سکے، وہ ایک گھٹیا درجے کے مزدور کا درجہ رکھتی ہے جسے مردوں سے نسبتاً بہت کم اُجرت کی ملازمتیں اور ایسے کام جیسے ہوٹلوں کے کمروں کی صفائی وغیرہ ہی مل سکتے ہیں۔

(۳) خدا اور مذہب کے نام پر تجارت اور سلیب و نہب جس انداز میں استعماریت مغرب نے روا رکھی ہے اس کی نظیر تاریخ عالم میں شاید ہی مل سکے گی۔ امریکہ کی نئی دنیا کی دریافت کے بعد بیشتر یورپی اقوام کے قافلے در قافلے آکر اس کے وسیع و عریض خطوں میں پھیلنے لگے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ان عیسائی اقوام

کے مشنز (MISSIONS) نے بھی ہر جگہ تبلیغی سکول و کالج و ہسپتال بنا کر مقامی ریڈ انڈینز (- RED INDIANS -) کے استیصال میں بالواسطہ یا بلاواسطہ کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ اس کی ایک تازہ مثال ہوائی کے (HAWAII) کے جزیرے ہیں۔ یہ دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکہ کی ریاستہائے متحدہ میں ایک نئی ریاست کے طور پر شامل کئے گئے ہیں۔ ہم اس کے صدر مقام (HONOLULU) میں ٹھہرے تو برسبیل تذکرہ ایک مقامی نے بتلایا کہ بہت عرصہ ہوا متعدد امریکن یورپین عیسائی مشنز (MISSIONS) نے وہاں آکر تبلیغی سکول اور شفا خانے بنائے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ مقامی جاگیرداروں کو ان کی ملکیتوں سے بے دخل کرنا شروع کیا تھا جس کے لئے تالیف قلوب کے طور پر چند ایک مقامی سرداروں کو خوبصورت مکان بنا دیئے تھے۔ یوں مقامی آبادکاروں کے استیصال کے بعد جب سے یہ ریاست ایک امریکن سٹیٹ بنائی گئی ہے حکومت ان عیسائی مشنز کو ان زمینوں کا معاوضہ دے کر ان پر اپنے محکمہ جات کے دفاتر وغیرہ تعمیر کر رہی ہے۔ گویا جو ٹیکنیک امریکی براعظم میں اختیار کیا گیا تھا اس پر بعینہٖ ہوائی (HAWAII) میں بھی عمل درآمد ہوا ہے۔

(۴) امریکی استعماریت کے مؤثر فروغ کے لئے ایجنٹ مذہبی تبلیغ کا نقاب دوسری عالمی جنگ کے بعد جاپان میں بھی بے دریغ استعمال کیا۔ چنانچہ یہ دیکھا گیا کہ جاپان کے بڑے بڑے شہروں میں، تمام قیام گاہوں یا ہوٹلوں کے ہر کمرے میں بائبل کا نسخہ موجود ہوتا ہے۔ جسے ایک نمایاں جگہ پر رکھا جاتا ہے اسی طرح جس طرح امریکہ کے کل دبیش چالیس ہزار وائی۔ ایم۔ سی۔ ایز میں یہ نسخے رکھے جاتے ہیں —— یہ نسخے (GIDEONS BIBLE) کے نام سے موسوم ہیں اور گیڈینز' وہ لوگ ہیں جو بزعم خود خدا کا کام کرتے ہیں۔ لادینی حکومتوں کی ان مذہبی کوششوں کے اثرات لاتعداد جاپانیوں کے عیسائیت قبول کرنے کی صورت میں منصۂ شہود پر آچکے ہیں۔

(۵) دنیا میں جہاں جہاں بھی تہذیب مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام رائج ہے، خواہ وہ شخصی حکومتیں ہوں (جن میں مسلمان ملک اب بھی پیش پیش ہیں) یا جمہوری اور رنائی، افراد و اقوام کا مقصود زندگی یکسر مادی مفاد خویش نظر آیا۔ اس نظام میں ہر جگہ مذہب کو (خواہ اسے اسلام کا نام ہی کیوں نہ دیا گیا ہو) سرمایہ داری کے سلب و نہب کو خوشگوار بنانے کے کام میں لایا جاتا ہے۔ اور پھر معاشرہ خود بخود ایک ایسا نیلام گھر بن جاتا ہے جس میں ہر مفاد کے حصول کے لئے بولی صرف سرمایہ دار دے سکتا ہے اور کسی کو اس کا حق نہیں پہنچتا۔ اس کا اثر یہ ہوا ہے کہ بے مزد خدمت کے جذبہ کی جگہ کام کی اُجرت کے علاوہ ٹپس (TIPS) کی توقع کی جاتی ہے۔ اس مذموم رسم کا استثناء صرف جمہوریہ چین میں دیکھا گیا، جہاں ہر فرد اپنے فرائض منصبی

ادا کر کے خدمت کا معاوضہ تک لینے سے گریز کرتا ہے۔ یہاں تک کہ غیر ملکی مہمانوں کا بھی بیمار ہونے کی صورت میں قریب قریب مفت علاج کیا جاتا ہے۔ چین کے شہر کینٹن میں ہم چند روز ایک ہوٹل میں مقیم تھے اور پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائینز کا دفتر اسی ہوٹل میں تھا۔ پی۔ آئی۔ اے (P.I.A.) کا ایک پاکستانی افسر ہمارے کمرے کے سامنے کمرے میں رہتا تھا۔ اُس کی چار چھوٹی چھوٹی بچیاں اُس اجنبی ماحول میں مجھ سے جلد ہی مانوس ہو گئیں۔ اُن سے معلوم ہوا کہ اُن کی والدہ کا ہسپتال میں آپریشن ہوا ہے۔ اگلے روز ہم خیریت پرسی کے لئے اِن بچیوں کے والد سے ملے تو انہوں نے یہ واقعہ بتلایا کہ تقریباً دس روز قبل اُنکی اہلیہ کو ایک خطرناک مرض کا دورہ پڑا تھا جس کے باعث فوری طور پر انہیں کینٹن کے بڑے ہسپتال میں لے جانا پڑا۔ رات کا وقت تھا۔ کم از کم چھ لیڈی ڈاکٹرز (SPECIALISTS) نے مریضہ کا معائنہ کر کے فوری آپریشن کا فیصلہ کیا اور نصف رات تک انتہائی تگ و دو سے آپریشن مکمل کر کے خطرے کو دور کیا۔ پھر ضرورت کے لحاظ سے دس روز تک نرسنگ کیا۔ اور اس تمام علاج معالجہ و مہیر آپریشن کے لئے صرف ٹوکن (TOKEN) فیس یعنی تقریباً گیارہ روپے لئے گئے۔

(۷) وہ ملک جہاں اشتراکی طرز کا نظام قائم ہے، وہاں صورتِ حال دوسرے ممالک سے یکسر مختلف نظر آئی۔ اِس فرق کے ساتھ کہ مشرقی جرمنی میں جہاں اشتراکی نظام استعماریت پسند جرمنوں پر ٹھونسا گیا تھا، اکراہ و جبر یعنی (REGIMENTATION) کے آثار برلن (BERLIN) جیسے بڑے شہر میں اداسی و ویرانی، ہوٹلوں اور قہوہ خانوں تک میں بے رونقی اور دلی تعاون کی معدومیت صاف نظر آ رہی تھی اس کے برخلاف چین میں یہ انقلاب افرادِ معاشرہ کے قلوب کی گہرائیوں سے اُبھرتا نظر آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا بھر کی استعماریت پسند قوتوں سے ٹکر لینا اُن کا جزوِ ایمان بن چکا ہے۔ بادی النظر میں کروڑوں انسانوں کی کامل ہم آہنگی اور اَن تھک محنت کے مادی نتائج اتنے شاندار معلوم ہو رہے تھے کہ اگر ان کا جذبہ و خلوص اپنے مقصد کے ساتھ اسی طرح قائم رہا تو یہ ایک دن بساطِ عالم کو اُلٹ کر رکھ دیں گے۔ لیکن انقلاب چین کے سولہ سال بعد ریڈ گارڈز کی ہنگامی تحریک کے ذریعہ عوام میں تجدیدِ عزم و اشاعت کی ضرورت اِس نظام کے کسی بنیادی سقم کی غمازی کر رہی تھی۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے۔ چین اور ہانگ کانگ کی سرحد پر ایک ادھیڑ عمر کی عورت کا لکڑی کی ایک ٹہنگی پر دو بھاری گٹھڑیوں کے علاوہ ایک شیر خوار بچے کو اپنی پیٹھ پر ایک جھولی میں اٹھا کر چلنا میرے لئے باعثِ حیرت تھا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایک کمسن بچے والی عورت بغیر کسی دل گرفتگی اور احساسِ اکراہ کے اس قدر جسمانی مشقت برداشت کر سکتی ہے، بجز اس کے کہ کوئی خاص اندرونی جذبہ اُس سے ایسا کروا رہا ہو۔ لیکن اس قسم کے جذبہ کا سراغ مجھے وہاں نہیں مل سکا۔

مجھے اس سوال کا اطمینان بخش جواب کہیں سے نہ مل سکا کہ ایک شخص دن بھر محنت اور مشقت سے کمائی کرے؛ اُسے دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے کیوں دے دے؟ اِس سوال کا جواب نہ ملنے کی وجہ سے روس مجبور ہو گیا ہے کہ وہ اپنے نظام میں تبدیلی کرے۔ اور اگرچہ چین آج اِسے بدعتی کہہ کر پکارتا ہے لیکن اُسے بھی کل کو یہی کچھ کرنا پڑے گا۔ اس سوال کا جواب میرے بزرگو! قرآنِ کریم کے علاوہ اور کہیں سے نہیں مل سکتا۔

میرے ان مشاہدات و تاثرات سے یہ بخوبی اندازہ ہو سکے گا کہ تمام موجودہ نظامہائے حیات جوانسان کے خود ساختہ ہیں، قرآنِ کریم کی صراطِ مستقیم سے ہٹے ہوئے ہیں۔ اور اب نوعِ انسانی کی فوز و فلاح کیلئے خدائے تعالیٰ کا عطا فرمودہ نظامِ ربوبیّت ہی وہ توازن بدوش راستہ ہے جس کے اختیار کرنے سے سحر نمودار ہوگی۔ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا ۵ [وہ وقت قریب آرہا ہے، جب] زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اُٹھے گی۔

(والسلام)

---

(۱۰)

(صحیفۂ پرویز کی دو بچیاں)

بجمہ کوثر

آثار بتاتے ہیں سحر ہو کے رہے گی

صدرِ محترم اور بزرگو!

میری بہنوں اور بھائیوں میں سے ایک ایک سٹیج پر آیا اور یہ نویدِ جانفزا سناتا چلا گیا کہ —— آثار بتاتے ہیں سحر ہو کے رہے گی —— وہ یہ کہتے تھے اور میں حیران ہو رہی تھی کہ سورج طلوع ہو کر سر پر آچکا ہے اور انہیں ابھی نمودِ سحر کے آثار ہی دکھائی دے رہے ہیں۔ پہلے تو بات میری سمجھ میں نہ آئی لیکن کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے اس کی وجہ معلوم کرلی۔ بات یہ ہے کہ طلوعِ سحر کے لئے فطرت کا پروگرام ہی کچھ ایسا ہے، کہ جب مغرب کی طرف بسنے والوں کو ہنوز طلوعِ سحر کے آثار دکھائی دیتے ہیں تو مشرق کی اطراف رہنے والوں کے ہاں اچھی خاصی دھوپ چڑھ رہی ہوتی ہے۔ ہمارا گھر خوش قسمتی سے مشرق بلکہ مشرقِ اقصیٰ میں واقع ہوا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں طلوعِ آفتاب کو ایک عرصہ ہو چکا ہے۔

اتنا لمبا عرصہ، کہ جب میں نے دنیا میں آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو اس کی کرنوں سے کھیلتے ہوئے پایا اور اس کے بعد آج تک کیفیت یہ ہے کہ ہم نے کبھی رات کی تاریکی دیکھی ہی نہیں۔ ہم صبح اُٹھتے ہیں، تو

باباجی کے سامنے قرآن کو کھلا پاتے ہیں۔ دن بھر ہمارے ہاں یا تو قرآن کی باتیں ہوتی رہتی ہیں اور یا خود قرآن کھلا رہتا ہے۔ قرآن کو خدا نے نورِ مبین اور سراجِ منیر کہا ہے۔ سو جس گھر میں یہ چمکتا ہوا سورج یوں ضیا بار رہے انہیں آثارِ سحر سے طلوعِ آفتاب کے اندازے لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ جو کچھ ابھی دوسروں کے خیالوں اور اندازوں میں جھلملاتا ہے وہ ہمارے صحن خانہ میں جگمگا رہا ہے۔ جس جنت کے تذکرے آپ حضرات ابھی درسوں میں سنتے آئے ہیں، ہم اس کے حیات افروز نظارے اپنے گھر میں قدم قدم پر خراماں خراماں دیکھتے ہیں ــــ ہمارا گھر نہیں، شجرِ طوبےٰ کی سکون آفریں شاخوں پر امن و سلامتی کا نشیمن ہے جس میں ہم ہنستے کھیلتے، چہچہاتے، بہاروں میں تلتے اور ستاروں پر کمندیں ڈالتے ہیں۔

اور گھروں کی طرح ہمارے گھر میں بھی مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن ہم ان سے گھبراتے نہیں۔ ہم نے یہ انداز اختیار کر رکھا ہے کہ ؎

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ملا اسے غمِ جاناں بنا دیا

جو معاملہ درپیش ہوا اُسے باباجی کے پاس لے کر چلے گئے اور انہوں نے اسے قرآن کی ایک آیت سے یوں سلجھا اور سمجھا دیا کہ اس سے اُس معاملہ ہی کی نہیں، ہمارے دل کی گرہیں بھی کھل گئیں۔ کس قدر آسان ہی نہیں پُر کیف ہو جاتی ہے یہ زندگی اتنی سی تبدیلی سے۔

میں، بزرگانِ گرامی قدر! دعا کرتی ہوں آپ آمین کہیئے، کہ خدا اس آفتابِ جہانتاب کو ہمیشہ تابندہ و پائندہ رکھے۔ باقی رہی وہ سحر جسے آپ اُفقِ کائنات پر طلوع ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں تو وہ بھی نمودار ہو کر رہے گی۔ اس لئے کہ خدا نے کہا ہے کہ ہم نے انسانوں کو آسمانی راہ نمائی اس لئے دی ہے کہ وہ تاریکی سے نکل کر روشنی میں آجائیں۔ لہٰذا زندگی کی آخری منزل روشنی ہے، تاریکی نہیں۔ قرآن نے روشنی کو حق، اور تاریکی کو باطل کہا ہے۔ اور ساتھ ہی ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ حق اور باطل کی کشمکش میں حق بالآخر غالب آئے گا۔ اس نے مایوسی کو کفر کہا ہے، اس لئے خدا پر ایمان رکھنے والا زندگی کے انجام سے مایوس نہیں ہو سکتا۔ ابلیس مایوسی کا مظہر ہے۔ ابلیس سے مغلوب ہو جانا آدم کی شکست نہیں، خود خدا کی شکست ہے۔ اس لئے کہ ابلیس نے چیلنج آدم کو نہیں دیا تھا، خدا کو دیا تھا۔ یہی وجہ ہے جو اقبالؒ نے خدا کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ۔ ؎

زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا

خدا کو ہمارے نقصان کی پرواہ ہو یا نہ ہو، اپنے نقصان کو تو وہ کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔

اس لئے ہمیں گھبرانے کی کیا ضرورت ہے۔ طلوعِ سحر خود خدا کے پروگرام کی کامیابی کی دلیل ہے — ہم تو اس کے پروگرام کی تکمیل میں اس کے رفیق بن سکتے ہیں۔

خوش بخت ہیں وہ جو اس کے دست و بازو بننے میں آپ کے ساتھی ہیں۔ باقی رہے وہ جو سوتے تھے آپ کا ساتھ نہیں دے رہے، تو آپ اُن کا کچھ خیال نہ کیجئے۔ وہ وقت آنے کا جب آپ اُن سے سر اُٹھا کر کہہ سکیں گے کہ :-

رہ گئی بات، کٹ گئی شبِ ہجر
تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی؟

۲- سلمیٰ پرویز

میرے واجب الاحترام بزرگو! — اپنی جانی پہچانی بیٹی کا سلام لو!

آج کی تقریریں بڑی دلچسپ تھیں۔ شاعری ہوتی ہی بڑی دلچسپ ہے۔ میں نے ان تقاریر کو شاعری کہا ہے تو ہو سکتا ہے کہ اس سے بہت سے کان کھڑے ہو جائیں، اور بہت سی آنکھیں مجھے گھور کر دیکھیں، لیکن اس سے حقیقت نہیں بدل جائے گی — شاعری کرتی کیا ہے؟ وہ ایک تشبیہ لیتی ہے اور اسے حقیقت بنا کر پیش کر دیتی ہے۔ بعینہٖ یہی آج یہاں ہوا ہے۔ موضوع کے عنوان میں کہا گیا تھا کہ —

آثار بتلاتے ہیں سحر ہو کے رہے گی

اس کی تشریح کرتے ہوئے ہمیں بتایا یہ گیا کہ فطرت کا قاعدہ ہے کہ ہر شب کے بعد سحر ہوتی ہے اور جب نمودِ سحر قریب ہو تو ستارے ماند پڑ جاتے ہیں اور چاند کا چہرہ افسردہ ہو جاتا ہے، پھر سحر طلوع ہو جاتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ شب کے بعد سحر ہوتی ہے لیکن اس قسم کی سحر فطرت مجبور کے لگے بندھے قاعدے کے مطابق نمودار ہوتی ہے۔ اسے نہ کسی کی شدتِ آرزو وقت سے پہلے لا سکتی ہے نہ کسی چمگادڑ کی آنکھ اسے نمودار ہونے سے روک سکتی ہے۔ یہ سحر خارجی کائنات کی سحر ہوتی ہے لیکن —

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

سوال یہ ہے کہ کیا مومن اس اذان کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں جس سے اس قسم کی سحر نمودار ہوتی ہے؟ جہاں تک فطرت کے شب و روز کا تعلق ہے اس میں نہ تو رات کی تاریکی انسانوں کے سیاہ

اعمال کی پیدا کردہ ہوتی ہے اور نہ ہی صبح کی روشنی اُن کے حسنِ عمل کی تخلیق۔ لیکن انسانوں کی دنیا میں تاریکیاں بھی ان کی اپنی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔ اس لئے نورِ سحر بھی انہیں خود ہی پیدا کرنا ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے حسنِ عمل کی ایسی قندیلیں روشن ہو چکی ہیں جن سے ہمارے نامۂ اعمال کی تاریکیاں چھٹ جائیں؟ اگر ایسا نہیں تو پھر یونہی ایک تشبیہ سے خوش ہو جانا کہ سحر ہو کے رہیگی ۔۔۔ شاعری سے زیادہ کچھ نہیں۔ ع

چراغ گُل کر کے بیٹھ جانا تو کچھ دلیلِ سحر نہیں ہے

یہ ٹھیک ہے کہ جہاں تک دوسری اقوام کا تعلق ہے اُن کی شدتِ اضطراب ایک عظیم انقلاب کی آئینہ دار ہے اور امید کی جا سکتی ہے کہ اس سے بنودِ سحر ضرور ہوگی۔ لیکن اس سے ہمیں کیا حاصل ہوگا؟ ہماری رات تو اسی طرح تاریک کی تاریک ہی رہے گی ۔۔۔ میں بڑے بڑے مسائل سمجھنے کی مدعی نہیں۔ میں تو آپ کی چھوٹی سی بیٹی ہوں۔ اور میری باتیں بھی چھوٹی چھوٹی سی ہوتی ہیں۔ میں مسلسل پانچ سال سے ہر کنونشن میں ایک ہی بات دہرا رہی ہوں اور وہ یہ کہ جب تک آپ ہم بچوں اور بچیوں کی تعلیم کا صحیح انتظام نہیں کریں گے ہماری شبِ تاریک میں نمودِ سحر نہیں ہوگی۔ آپ ہر سال مجھ سے وعدہ کر کے چلے جاتے ہیں لیکن مجھے اس وقت تک اس میں نمودِ سحر کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے۔ میں آپ سے درخواست کروں گی کہ بجائے اس کے کہ ہم مطمئن ہو کر بیٹھ جائیں کہ ہم کچھ کریں یا نہ کریں سحر پیدا ہو کے رہے گی، ہمیں چاہیئے کہ ؎

لے کے خورشیدِ جہاں تاب سے مقراضِ شعاع
دامنِ شب میں گریبانِ سحر پیدا کریں!

میں بزرگانِ گرامی قدر! اس مرتبہ اس درخواست کو اور بھی شدت سے پیش کرنے کی جرأت اس لئے کر رہی ہوں کہ ۔۔۔ خدا میرے بابا جی کی ہزار سال کی عمر کرے لیکن ۔۔۔ فطرت کے قاعدے بڑے اٹوٹ واقع ہوتے ہیں ۔۔۔ ڈر ہے کہ ۔۔۔ اور اسکے بعد کچھ کہنے کی ہمت نہیں پاتی[1] بجز اسکے کہ

شبِ ہجراں کے جاگنے والو
کیا کرو گے اگر سحر نہ ہوئی؟

---

[1] اس مقام پر اس بچی کی ہچکی بندھ گئی۔ اور فضا پر درد و گداز کا ایسا سماں طاری ہوا کہ کوئی دل نہ تھا جو دقفِ الم اور کوئی آنکھ نہ تھی جو اشکبار نہ ہو ۔۔۔ بعد کا فقرہ یہ بچی بمشکل ادا کر سکی۔ اور اس نے محفل کو تڑپا تڑپا دیا۔

اختتامیہ

——— از صدر مذاکرہ

معزز حاضرین و عزیز بہنو اور بیٹیو!

آپ سب نے جس دلچسپی سے ہمارے سلیم بیٹوں اور طاہرہ بیٹیوں کے افکار و نظریات کو سنا ہے، اس کا شکریہ! ویسے یہ شکریہ کچھ رسمی سی چیز ہے۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ ہم سب کو اُس خداوند ذوالجلال کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے جس کی رحمت نے ہمیں خوابِ غفلت سے بیدار کر دیا ہے اور ہماری کوششوں کے بغیر ایک مردِ مومن، ایک پروانۂ شمعِ قرآنی کو ایسی توفیق عطا کی کہ اس کی تربیت اور رہنمائی میں ہماری نئی نسل نے اپنی فکر و بصیرت کے گوہرِ آبدار ہماری جھولیوں میں ڈال دیئے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ قوم کے یہ نونہال صراطِ مستقیم پالینے ..... اور شمعِ قرآنی سے دلوں کو منور کرنے کے بعد بلا خوف و خطر آگے بڑھتے رہیں گے اور آنے والی نسلوں میں اِن کے ذکرِ خیر کے ساتھ ساتھ ہمارا بھی ذکرِ خیر جاری رہے گا کہ ہم نے ان کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی میں کوتاہی نہیں کی۔ اور اب غالباً آپ سب مجھ سے عنقریب متفق ہونگے کہ سحر طلوع ہو رہی ہے۔

اس سے پہلے کہ ہماری یہ محفل برخاست ہو، آپ سب سے میری یہ استدعا ہے کہ آیئے ہم سب مل کر اپنے رب سے اس تحریک کی کامیابی، اور بانیٔ تحریک، پروانۂ شمعِ قرآنی، جناب پرویز صاحب کی سلامتی کی دعا کریں ——— اللہ تعالےٰ اس شمعِ علم و حکمت کو تا دیر سلامت رکھے اور ہمیں اُن سے فیوض و برکات حاصل ہوتے رہیں۔ آمین!

عزیزہ بیٹی سلمےٰ کے محبت آمیز شکوے نے دل کی عجیب حالت کر دی ہے اور اب کچھ بولنے کی ہمت بھی نہیں رہی۔ اس دعا کے ساتھ آپ سب کو خدا حافظ کہتی ہوں۔ کہ

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝

———•———

شکریہ!

اس طرح قریب چار گھنٹے پر مشتمل، یہ بصیرت افروز، حسین و جمیل محفل، باصد وقار اختتام پذیر ہوئی۔

ایک گراں مایہ پیشکش

قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ اس میں ـــــ

(۱) کچھ قوانین ہیں جو متعین شکل میں دیئے گئے ہیں۔

(۲) کچھ اصول ہیں جو ہمیشہ غیر متبدل رہتے ہیں لیکن ان کی حدود کے اندر رہتے ہوئے "ملتِ اسلامیہ" اپنے زمانے کے تقاضوں کیمطابق جزئی قوانین خود مرتب کرتی ہے ـــــ اور

(۳) کچھ مستقل اقدار ہیں جنہیں اسلامی مملکت اپنے آئین کی بنیاد قرار دیتی ہے۔

یہ قوانین کیا ہیں؟ ـــ یہ اصول کونسے ہیں؟ ـــ یہ اقدار کس قسم کی ہیں؟

یہ وہ سوالات ہیں جو آج ہر قلب سے ابھرتے ہیں، لیکن ان کا جواب کہیں سے نہیں ملتا!

ان کا جواب ملیگا پرویز صاحب کی تازہ ترین تصنیف

قرآنی قوانین

سے ـــ جو اس موضوع پر ان کے تدبر فی القرآن کا ماحصل ہے! اور ہر "ماحصل" کی طرح ضخامت میں کم لیکن افادیت میں بیش از بیش ہے!

یہ کتاب ـــــ

(۱) ہر مسلمان کے ہاتھ میں،

(۲) ہر قانون دان (وکیل) کی لائبریری میں،

(۳) ہر جج کے میز پر، اور

(۴) کارپردازانِ مملکت کے شیلف میں ـــــ ہونی چاہیئے!

عمدہ سفید کاغذ، خوبصورت جلد ـــ قیمت: تین روپے

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔ بی۔ گلبرگ لاہور

عندلیبِ قرآنی کا بازو ٹوٹ گیا

پرویز صاحب کے درسِ قرآن میں میاں بیوی کا ایک جوڑا برسوں سے بالالتزام آیا کرتا تھا۔ بیوی، قرآنی حلقہ کی جانی پہچانی محترمہ خاتون، ثریّا حندلیب۔ میاں، محکمہ ریلوے کے ایک ممتاز افسر حبیب اللہ خان۔ دونوں کا ذوق ہم رنگ، دونوں کی فکر یک آہنگ، دونوں قرآن کے والہ و شیدائی، دونوں پاکیزہ سیرت اور بلند اخلاق کے نورانی پیکر، ان کی باہمی رفاقت، صحیح قرآنی زوجیت کی تفسیر، ان کا گھر جنّت کی نظیر۔ چند ماہ اُدھر حبیب اللہ خان کا تبادلہ اسلام آباد ہوگیا۔ وہاں وہ درسِ قرآن بذریعہ ٹیپ سنتے رہے۔ اب حسبِ تکمیل درس میں شرکت کے لئے تیاریوں میں مصروف تھے کہ اچانک ۱۰ دسمبر کی شام گھر سے باہر حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے۔ ثریّا بہن کی دنیا تاریک ہوگئی۔ ہم سب کا ایک مخلص قرآنی بھائی ہم سے بچھڑ گیا۔ معاشرہ ایک مجسمہ دیانت و صداقت اور پیکرِ شرافت و نجابت سے محروم ہوگیا۔

ثریّا بہن! آپ کے جملہ قرآنی بھائی اور خود مفکرِ قرآن آپ کے اس جگر پاش صدمہ میں آپ کے شریکِ غم ہیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے کہ اُنکے حسنِ عمل کا وہی مقام ہے اور آپ اور دیگر اعزہ کو صبرِ جمیل کی توفیق عنایت کرے۔ آپ قرآنی تعلیم کی پیغام رساں ہیں اس لئے ہمیں کامل اُمید ہے کہ آپ اس صدمہ کو مومنانہ استقامت سے برداشت کرینگی۔

شریکِ غم

(مرزا) محمد خلیل، ناظم ادارہ طلوعِ اسلام-لاہور

دو اہم کتابیں

جہاد اسلام کے اس بنیادی اصول کے متعلق حقیقت کتا بحث، اور مخالفین کے اعتراضات کا مسکت جواب۔ ایک مختصر لیکن جامع تصنیف۔ قیمت صرف دو روپے۔

پاکستان کا معمارِ اوّل سرسید کا صحیح مقام اور قوم اور اسلام کے لئے اس کی خدماتِ جلیلہ کا تذکرہ نہایت دلکش انداز میں۔ قیمت۔ تین روپے۔

ناظم۔ ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵/بی گلبرگ۔ لاہور

ابرِ رحمت جھوم کر آگیا

جشنِ چہاردہ صد سالہ نزولِ قرآن ، سالانہ جشنِ نزولِ قرآن ، و جشنِ تکمیلِ درسِ قرآن !

یہ تینوں جشن

۷ جنوری ۱۹۶۸ء بروز۔ اتوار۔ صبح ۹½ بجے۔ ادارہ طلوعِ اسلام واقعہ ۲۵ بی گلبرگ

نزد مین مارکیٹ

میں نہایت تزک و احتشام سے منائے جائیں گے۔ پوری تقریب میں قرآن کریم سے متعلق باتیں ہونگی۔
آپ کی تشریف آوری باعثِ صد مسرت ہوگی !

(میرزا) محمد خلیل
نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام۔ لاہور

عربی خود سیکھئے

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گیا تھا۔ اور ملک کے تعلیم یافتہ گوشوں سے اسکی افادیت کے متعلق بڑی بلند آراء موصول ہوئی تھیں۔ اب کے جدید ایڈیشن میں علاوہ ترمیم اور تصحیح کے قریب ایک سو صفحات پر مشتمل ایسے گوشواروں کا اضافہ کیا گیا ہے جن میں ساری عربی گرامر سمٹ کر آگئی ہے۔ اس سے یہ کتاب ایک بالکل جدید تصنیف بن گئی ہے۔ اور ضخامت ساڑھے تین سو صفحات تک پہنچ گئی ہے۔

جلدی منگوا لیجئے۔ تاکہ یہ ایڈیشن بھی ختم نہ ہو جائے !

قیمت۔ (علاوہ محصول ڈاک) ساڑھے چار روپے !

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵ بی گلبرگ لاہور

طلوعِ اسلام کی کتابیں ــــ اور ــــ ماہنامہ طلوعِ اسلام

یہاں سے بھی مل سکتے ہیں

لاہور (۱) انٹرنیشنل بک سروس ۔ ۷۵ دی مال لاہور

(۲) کلاسیک بک سیلرز .. ۴۲ دی مال "

(۳) پیپلز پبلشنگ ہاؤس .. ۲۶ دی مال "

(۴) نذیر بک ایجنسی .. ۱۱ ریلوے روڈ لاہور

(۵) لاہور بک ڈپو .. .. ۴۵ دی مال "

(۶) بک سنٹر .. .. چوک ریگل دی مال "

(۷) ادبستان .. .. چوک لکشمی میکلوڈ روڈ "

(۸) آئیڈیل بک شاپ .. ۱۹۴ انار کلی "

(۹) مکتبۂ پاکستان .. .. چوک انار کلی "

(۱۰) گوشۂ ادب .. .. چوک انار کلی "

(۱۱) اسمٰعیل اینڈ برادرز .. چوک انار کلی "

(۱۲) نیشنل بک سٹال .. .. چوک انار کلی "

(۱۳) ماڈل بک سٹال ۔ نولٹن مارکیٹ دی مال "

(۱۴) اورنیکا بک سٹال ۔ ۔ گلبرگ ۔ لاہور

(۱۵) پیپلز پبلشنگ ہاؤس ۔ المنار مارکیٹ چوک انار کلی ۔ لاہور

لائلپور (۱) محمد احمد صاحب متعلم ایم اے گلی ۔ بلاک اے نزد سرائی خانہ مسجدی ۔ ریل بازار

(۲) شریف برادرز بک سیلرز ۔ کارخانہ بازار ۔ لائلپور

(۳) حافظ محمد یونس صاحب ۔ اے ۔ ۶ ۔ گلبرگ ۔ لائلپور

سرگودھا حکیم محمد حسن نظامی ۔ نظامی دواخانہ بلاک ۔ ۶ ۔ گلی مچھلی والی ۔ سرگودھا۔

کراچی (۱) محترم محمد اسلام صاحب ۔ (۴ ۔ ۱۰۰۹) لوئیس روڈ ۔ نیو ٹاؤن ۔ کراچی ۵

(۲) ہر اتوار کی صبح ۔ ۹ بجے تا ۱۲ بجے ۔ سندھ اسمبلی ہال بندر روڈ ۔

(۳) گلدستہ انجمن کتاب گھر ۔ وکٹوریہ روڈ صدر

(۴) عوامی کتب خانہ ۔ بولٹن مارکیٹ

(۵) شیخ شوکت علی اینڈ سنز ۔ بندر روڈ کراچی

(۶) جنرل بک ڈپو ۔ فریئر روڈ ۔ نزد حبیب بنک کراچی ۔

(۷) اقبال کتاب گھر ۔ سمرسٹ سٹریٹ ۔ کراچی صدر

راولپنڈی (۱) محترم عزیز احمد قریشی صاحب ۳۔F۲۳ بھابھڑا خانہ

(۲) بک سنٹر ۔ لارنس روڈ ۔

(۳) ظفر بک سٹال ۔ گورنمنٹ ٹرانسپورٹ سٹینڈ صدر

(۴) گورنمنٹ ٹرانسپورٹ اسٹینڈ ۔ اسلام آباد ۔

(۵) بک سٹال ۔ چوک فوارہ ۔ راجہ بازار ۔

لیہ :۔ نقل ہوٹل ۔ نزد ریلوے اسٹیشن ہر جمعہ کو بعد نماز عصر ۔

انگلستان :۔ محترم رشید احمد بٹ صاحب ۔ ۱۶۰ سالٹ سٹریٹ ۔ بریڈ فورڈ ۸

میانوالی ــــ صوفی عبدالرحمٰن صاحب جلدساز چوک فتح خان ۔ ملک مظفر سٹریٹ ۔ میانوالی ۔

مردان ــــ (۱) صادق کمیشن ایجنسی ۔ بکٹ گنج

(۲) صدیقیہ انجینئرنگ ورکس ۔ بینک روڈ ۔

ملتان :۔ سوانشکدہ حسین آگاہی

مجلس مندوبين

خدا اور سرمایہ

ایک بصیرت افروز اور معلومات افزا پیش کش

کیا اسلام، مغرب کے معاشی نظام کا حامی ہے ــــــ ؟

- کیا اسلام، اشتراکی نظام کا حامی ہے ــــــ ؟
- کیا اسلام کا کوئی اپنا معاشی نظام ہے ــــــ ؟
- اس نظام کی تفاصیل کیا ہیں ــــــ ؟
- وہ کس طرح دوسرے معاشی نظاموں سے مختلف ہے ــــــ ؟
- کیا وہ نظام، نوع انسان کے معاشی مسئلہ کا اطمینان بخش حل پیش کر سکتا ہے ــــــ ؟
- اس نظام کی مخالفت کس طبقہ کی طرف سے ہوتی ہے، اور کیوں ؟

یہ، اور اسی قسم کے دیگر معاشی مسائل کا تجزیہ، تبصرہ اور حل۔ عصر حاضر کے پریشاں انسان کے لئے شعاعِ امید۔ اہلِ پاکستان کیلئے قندیلِ راہ۔

قسم اعلیٰ ــ سفید پرنٹنگ پیپر۔ نہایت روشن طباعت۔ مضبوط جلد۔ حسین گردپوش۔

قیمت ــ نو روپے

سستا ایڈیشن ــ نیوزپرنٹ ــ بکس بورڈ کور ــ قیمت ــ پانچ روپے

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ۔ لاہور